ناظر کاکوروی

شجاعت علی سندیلوی

شکریہ

بڑی ناسپاس گزاری ہوگی اگر اس کتاب کی اشاعت کے سلسلہ میں حسب ذیل حضرات کا شکریہ نہ ادا کیا جائے جن کی بے لوث مخلصانہ مساعی و توجہ کے بغیر یہ کتاب نہ تیار رہی ہو سکتی تھی اور نہ اشاعت ہی کا انتظام ہو سکتا تھا۔ ہم لوگ نہایت مسرت سے حسب ذیل حضرات اور اداروں کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔

جناب حبیب اللہ صاحب ہاشمی منیجر شانتی پریس (الہ آباد) جناب ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی، سید احتشام حسین لکھنؤ یونیورسٹی، جناب منشی وصی احمد صاحب لائبریرین میونسپل لائبریری سندیلہ ضلع ہردوئی، میونسپل لائبریری سندیلہ، گنگا پرشاد لائبریری لکھنؤ، امیر محل لائبریری کاکوری لکھنؤ

ناشر:- شانتی پریس ۱۲ بینک روڈ، الہ آباد

بار اوّل ایک ہزار جولائی سنہ ۱۹۵۶ء

قیمت ہے

ظہیر صاحب!

”سپردم بہ تو مایۂ خویش را“

پیش گفت

عرصہ ہوا علامہ پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی نے ایک نجی صحبت میں ارشاد فرمایا تھا کہ پچھلے بیس پچیس برسوں میں علم نفسیات نے خاصی ترقی کی ہے اور میرے خیال میں اب یہ علم زندگی کے اکثر شعبہ جات پر چھا بھی گیا ہے۔ وقت ہے کہ شعراء اور اُدبا کے بیش قیمت شہ پاروں کو نفسیات کی روشنی میں دیکھا جائے اور متقدمین کے سرمایۂ ادب کو نئے معیاروں اور جدید زاویوں سے پرکھا جائے۔ یہ صحیح ہے کہ ہر شخص جو شعر موزوں کر سکتا ہے وہ شاعر نہیں کہا جا سکتا۔ اسکے علاوہ کچھ اور صلاحیتوں کی بھی احتیاج ہے۔ شعر میں چلتی پھرتی زندگی کی ضرورت ہے۔ شعروسخن کی صحبتوں میں اکثر یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ اکثر کلام ایسا سننے میں آتا ہے کہ جس کو شعریت سے قطعًا واسطہ نہیں ہوتا۔" علامہ کیفی کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ دورِ حاضر کی تصانیف یا شعری تحریکات اس معیار پر پرکھی جائیں جو لیوِنس۔ رچرڈسن یا ایلٹ نے پیش کیا ہے بلکہ علامہ کیفی کا مقصد اسی قدر ہے کہ اب آئندہ نئے زاویوں اور جدید قدروں سے ادب کے شہ پاروں کو پیش کیا جائے۔ گزشتہ طریقۂ کار کو جلد از جلد بدلنا چاہئے کیونکہ اگر وقت کی پکار پر لبیک نہ کہا گیا تو ہماری ادبی مساعی اُس حالت میں مجبوراً ٹکسال باہر تصور کی جائیں گی۔ روایت سے بغاوت ہم کو ورثہ میں ملی ہے۔ یہ ورثہ علیٰ حالہٖ آج بھی باقی ہے۔ یہ یقینی ہے کہ باوجود بغاوت کے روائت کے آثار ہمیشہ قائم رہیں گے اور داخلیت مناسب موقعوں پر ضرور ابھرتی رہے گی اور اس سے کون انکار کر سکتا ہے؟ ہمارے خیال میں وہ ادبی روایات جو زندگی سے کوئی واسطہ نہ رکھتی ہوں ان کو ادب سے کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے جہاں

زندگی کارفرما ہوتی ہے سماج کا مسئلہ بھی اُٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ سماج ہی پر کیا موقوف دنیا سامنے آجاتی ہے اور اُسی میں خود فنکار کی ہستی بھی شامل ہے۔ ہم اگر ان امور کو پیش نظر رکھیں تو ادبی معیار قائم رہ سکتا ہے۔

اس "تنقیدی سرمایہ" کا ادبی وقار کیا ہے؟ اس کو ناقدین کرام ہی بتلائیں گے۔ لیکن فی زمانہ مشکل یہ ہے کہ ہر شخص ناقد ہے خواہ اُس کو تمام عمر اپنی زندگی میں کسی تنقیدی مقالہ کو دیکھنے یا سننے کا موقعہ ہی نہ ملا ہو دراں حالیکہ اُس کو پڑھنا بے حد دشوار ہے۔ ہر شخص نہ فلسفی ہو سکتا ہے اور نہ ادیب نہ مہندس ہو سکتا ہے اور نہ سیاسیات سے دلچسپی لے سکتا ہے۔ آجکل ادبی بے راہ روی کا یہ ادنیٰ کرشمہ ہے کہ ایک ہی شخص کو بہ یک وقت شاعری، فلسفہ، ادب، سیاسیات، طبعیات، مذہبیات، تاریخ اور افسانوی سرمایہ پر مجبوراً تبصرہ کرنا پڑتا ہے۔ حالانکہ ہونا تو چاہئے تھا کہ ہر فن پر علیحدہ مبصرین کا انتخاب ہوتا۔ اگر ریاضی کی کتاب ہے تو کسی ریاضی داں کی رائے حاصل کرنا چاہئے اور یہی طریقہ آج مغربی دانشوروں میں رائج بھی ہے۔ ہمارے ملک میں باوجود آزادی کے ہنوز قدیم اصول پر مصنفین کے گلوں پر کند چھری چلائی جاتی ہے اور اسی اصول کے تحت برابر کتابوں کی قیمت گرتی اور بڑھتی رہتی ہے۔ اس روئیہ کے خلاف ہم کو قومی محاذ بنانا چاہئے۔ اور متحدہ بغاوت ہی سے روایت قائم کی جا سکتی ہے۔ اصل یہ ہے کہ ابھی تک تبصرہ نگاری کا طریقہ سنجیدگی سے ہندوستان میں رائج نہیں ہوا ہے۔ یہاں تو اس کلیہ کے برعکس غریب ناقد کو بہ یک وقت مذہبیات، سیاسیات، طبعیات نیز نجات، ادبیات، معاشیات غرض ہر فن کا ماہر ہونا پڑتا ہے۔ وہ غریب مجبور ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ بیشتر نقد و تبصرے کمزور، تشنہ اور بے کیف نظر آتے ہیں اور بسا اوقات

جماعتی حیثیت سے ان میں جنبہ داری کی بو بھی آتی ہے۔ ایسے ہی تبصرے کتاب کے محاسن کو برباد و تباہ کر دیا کرتے ہیں اور ایسے ہی گمراہ کن تبصروں سے مختلف قسم کی غلط فہمیاں بھی پیدا ہوا کرتی ہیں۔ یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ ادب پر سرمایہ داری کا نظام مسلط ہو گیا ہے اور ادب برائے ادب کا قومی ترقی پسند نعرہ بے اثر ہوتا جاتا ہے۔ خدا کا شکر ہے ترقی پسند مصنّفین اس کمزوری سے خوب واقف ہیں اور اسی لئے ان کے تبصرے جاں دار اور وزنی ہوتے ہیں لیکن خود غرض جماعتوں سے برابر مساعی جلیلہ کو پامال کرنے کی کوششیں ہوتی رہتی ہیں اور اس کی ذمہ داری ان حضرات پر عائد کی جا سکتی ہے جو گو فن تنقید سے قطعًا نابلد ہیں لیکن وہی لوگ ہر فن کی کتابوں پر آزادی سے اظہار خیال کرنے کے عادی سے ہو گئے ہیں اور یہ بڑی جرأت ہے۔ خدا ایسے نادان دوستوں سے محفوظ رکھے۔ بہر حال انیس کا مطالعہ جدید زاویوں سے پیش کیا گیا ہے اور ان بے راہ رویوں سے احتراز کیا گیا ہے جو فی زمانہ بعض سستے رسائل و جرائد میں رائج ہیں۔ اصل یہ ہے کہ اس ادبی بدعت سے بچنا چاہیئے اور اس کے خطرناک نتائج سے محتاط طبقہ کو احتراز کرنا چاہیئے۔ اسی روشنی میں امید کی جاتی ہے کہ مطالعہ انیس پر اظہار خیال کیا جائے گا۔

نگاہِ قہر کو گلشن نظر آتا ہے ویرانہ
نگاہِ مہر ویرانے میں گلشن دیکھ لیتی ہے

لکھنؤ
۲۶ جنوری (یوم جمہوریہ) ۱۹۵۶ء

ناظر کاکوروی
شجاعت علی سندیلوی

تمہید

موت بڑی تکلیف دہ ہوتی ہے اور اس کا تصور بھی کچھ کم قیامت خیز نہیں ہوتا بلکہ سچ تو یہ ہے کہ اس خیال کے آتے ہی انسان اپنی صحیح حیثیت کا جائزہ لینا شروع کر دیتا ہے شاید اسی لئے جملہ مذاہب میں انسان کو اپنی موت کو یاد کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ ظاہر ہے ایسے خطرناک واقعہ کا ذکر بھی کس قدر عبرت انگیز ہو سکتا ہے۔ جیسے جیسے زمانہ بدلتا گیا نئی قدریں ابھرتی گئیں پرانے زاویے ٹکسال باہر ہوتے گئے اور زمانہ شناس ترقی پسند ادبا نے اس حادثہ ہوش ربا کا ذکر اپنے مخصوص انداز میں کیا اور خوب کیا کسی نے دائمی نیند سے تشبیہ دی ہے اور کسی نے سکون دائمی کہا ہے اور کسی نے نشاط روح سے تعبیر کیا ہے لیکن اس میں کوئی شبہہ نہیں ہے کہ جب کسی ادیب یا فنکار کو اپنے کسی عزیز ترین محبوب کے خد و خال کی تاراجی کا کوئی واقعہ بیان کرنا پڑتا ہے تو اس کو شعوری یا لاشعوری طور پر مرثیہ ہی کے دامن میں پناہ لینی پڑتی ہے جس کی کوئی ہیئت نہیں ہے کوئی شکل نہیں وہ تو ایک مستقل جذباتی سیلاب ہے جس شکل و صورت میں رونما ہو جائے اس کے لئے مربع، مسدس، مخمس، ترکیب بند، قطعہ، غزل، قصائد سب راہیں یکساں ہیں۔ عجمی و عربی ادب میں مراثی کا ایک خاص مقام اور بڑا درجہ ہے۔ انگریزی ادب میں بھی مراثی کا ایک مخصوص مقام ہے۔ مرہٹی، تامل، تلگو، بنگالی، کنڑی اور ہندی ادب میں بھی مراثی کا ایک مخصوص درجہ موجود ہے۔ عربی ادب میں فرزدق کے مراثی کافی مشہور ہیں۔ ہندوستان میں بھی ایرانی امتزاج سے اردو ادب میں اس صنف پر کافی توجہ کی گئی لیکن اس حقیقت سے بقول بیگم پرنس محمد اسمٰعیل کسی طرح انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ہمارے ادب میں عرصہ سے مراثی کا موضوع یکسر مذہبی ہو گیا۔

اسی لئے کسی نے ادبی وقار قائم رکھنے کی مطلق کوشش نہ کی۔ ہر شخص نے تبرکاً و تیمناً امام ہمام کے غم میں کچھ نہ کچھ کہہ کر نجات دارین حاصل کرنے کی کوشش کی مرثیہ رزمیہ نظم کی قائم مقامی کرتا ہے۔ گو اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اب تک باوجود ادعائے ترقی کے رزمیہ نظم کا صحیح مفہوم ہمارے ناقدین کرام نے پیش نہیں کیا اور اگر کسی نے کوشش بھی کی تو مطلق کامیابی نہ ہوئی۔ اسی لئے ابھی تک کوئی واضح تصور اس صنعت کا ہماری ذہنیتوں پر قائم نہیں ہے۔ مرثیہ میں جذبات سے کام لیا جاتا ہے۔ احساسات سے تاثر پیدا کیا جاتا ہے اور حسیات پر زور ڈالا جاتا ہے اور مزید رنگ آمیزی کے لئے جذبات و احساسات، کردار و اخلاق۔ مناظر اور تاریخی واقعات سے بھی سہارا لیا جاتا ہے اور دبستان لکھنؤ کے ادبا نے روزمرہ۔ محاورات۔ صنائع بدائع۔ حسن بیان۔ جدت ادا۔ مناظر قدرت۔ جذبات فطرت اور واقعات نگاری سے بھی مراثی میں حسن پیدا کیا۔ تاریخی حیثیت سے ہم کو دکن میں پرانے مراثی ضرور ملے ہیں جن کی بڑی تعداد انڈیا آفس لندن میں موجود ہے۔ لیکن اس سرمایہ سے ادبی حیثیت سے ہمارے شعور میں کوئی بیداری نہ پیدا ہو سکی۔ ایک صاحب طرز بزرگ نے دکن کے مراثی دکھلاتے ہوئے سعدی کاکوروی کا بھی ایک مرثیہ دکھلایا لیکن ہمارا خیال ہے کہ یہ سعدی کا نہیں ہو سکتا بلکہ کوئی اور سعدی ہونگے جو دکن میں غواصی کے معاصر تھے۔ یہ مرثیہ قدیم زبان میں تھا ادبی حیثیت سے کوئی قابل قدر کارنامہ تو نہ تھا۔ لیکن سند کے لئے کافی ہے۔ یہ مرثیہ دکن میں بیحد مشہور ہے۔

لکھنوی مرثیہ نگاروں نے اس فن میں بعض مفید ایجادیں بھی کیں۔ چنانچہ شاہی سرپرستی کے زیر اثر سوز خوانی شروع ہوگئی۔ ابھی تک سوز خوانی کی کوئی مکمل

تاریخ مرتب نہیں ہو سکی ہے لیکن اس میں کوئی شبہہ نہیں ہے کہ اس فن کو عروج کمال تک پہنچانے میں شہنشاہ سخن انیس کے حواریں کو بڑا دخل رہا ہے۔[ع۵]

جنگ عظیم کے بعد مرثیہ مذہبی قیود سے باہر نکلا اور اب کھل کر روایت سے بغاوت شروع ہو گئی۔ انیس و دبیر کی شہرت تو علی حالہ قائم تھی لیکن جن شعراء نے مرثیہ نگاری میں شہرت صادقہ حاصل کی وہ محض مرثیہ گو ہی نہ تھے بلکہ ادب میں اُس کا مقام مختص تھا اور اُردو ادب کے بقائے دوام کے دربار میں ان کی نشستیں محفوظ تھیں۔ شبلی، حالی، اقبال، جوش، چکبست، حفیظ جالندھری، سراج مچھلی شہری صفی لکھنوی، آنند نرائن ملا، روش صدیقی، اقبال احمد سہیل کی خدمات اس سلسلہ میں زیادہ روشن ہیں۔ ہندوستان کے رہبر اعظم مہاتما گاندھی کے سفاکانہ قتل کے موقع پر ہزارہا مرثیہ اُردو زبان میں شائع ہوئے۔ جن میں بعض مراثی تو ادب اُردو کی جان کہے جا سکتے ہیں۔ مولانا محمد علی جوہر کی وفات پر بھی اچھے ادبی مرثیے شائع ہوئے۔ تلک کا مرثیہ تو چکبست کا آج تک مشہور ہے۔ یہ دور یقیناً زیادہ تابناک اور مبارک ہے۔ مرثیہ میں سلام، بین اور نوحہ کا بھی خاص درجہ ہے۔ عجیب اتفاق ہے لکھنوی دبستاں میں مردوں کے دوش بدوش

ع۵ سید مہدی حسن مرشد آبادی، سید منجھو صاحب لکھنوی، سید سجاد حسین لکھنوی، نادر لکھنوی، سید زندہ رضا لکھنوی نے اس فن خاص میں بہت ناموری کی۔ آجکل آلہ آباد میں نواب ابن صاحب (سید محمد عسکری صفوی) سوز خوانی میں بے حد مشہور ہیں۔ نواب صاحب نے سوز خوانی میں میلاد معری کی لطیف ایجاد کی اور جنگ کے تلازموں سے بھی خاصا کام لیا ہے۔

خواتین میں بھی شریمتی روپ کماری، شریمتی چاندرینہ، شریمتی جانکی بائی، خورشید جہاں لکھنوی وزیر جہاں الہ آبادی اور حسین باندی لکھنوی کے نام بے حد مشہور ہیں۔ سید محمد عسکری صفوی عنقریب سوز خوانی کی تاریخ شائع کرنے والے ہیں اور امید ہے کہ اس سے ادب اُردو میں مفید اضافہ ہوگا۔

خواتین بھی ہر سال تبرکاً تیمناً اچھے سلام، عمدہ نوحے اور موثر بین لکھتی رہتی ہیں۔ کاش وہ کہیں جمع کئے جا سکتے۔ سید زوار عباس امیر الصدر الہ آبادی خود اچھے مرثیہ گو ہیں اُنکے پاس ایسے نسخوں کا کافی سرمایہ موجود ہے اگر شائع ہو جائے تو بڑی ادبی خدمت ہوگی۔

ادب پرستوں کے لئے یہ کس قدر شرمناک مسئلہ ہے کہ میر انیس کے جلالت وشان کو دیکھتے ہوئے ان کے مسکونہ مکان اور مزار کی کوئی نگہداشت بھی نہ کی گئی کوکوچہ انیس آج بھی موجود ہے لیکن کوئی خوش ذوق اُس طرف جانا نہیں چاہتا۔ ایک یورپین طالبہ ادب اُردو کی تعلیم کے لیے آئی تھی مشکل مزار پر حاضر ہو سکی اور بڑی حسرت سے اُس نے کہا تھا کاش انیس یورپ میں پیدا ہوتے تو آج اُن کا مزار مستقل اکاڈمی ہوتا۔ صاحبان تشنگان ادب دور و نزدیک سے جاکر اپنی علمی پیاس بجھاتے گو انیس کے مداحوں نے اُنکے جسم کا آخری قطرہ خون چوسنے میں مطلق تکلف نہ کیا لیکن اُن کے خاندان کی کفالت کا بار اٹھانے سے بھی احتراز کیا۔ شکر ہے ابھی حال میں حکومت ہند نے اُن کے مکان اور مزار کو محکمہ آثار قدیمہ کے سپرد کر دیا۔ یہ ایک بڑی ادبی خدمت ہے اور یہی ایک تحفظ کا ذریعہ ہو سکتا تھا۔ انیس کی روشن خدمات کا تو یہ اقتضا تھا کہ آج ایک اکاڈمی اُنکے نام سے قائم ہوتی جہاں انیس کے مخطوطات محفوظ کئے جاتے اُن کے خطوط جمع کئے جاتے ان کے نجی ڈائری کے اوراق، اُن کے کپڑے، اور اُن کے استعمالی سامان ظروف کی نمائش کی جاتی۔ ان کی اور ان کے خاندان کے دوسرے باکمال افراد کے فوٹو ہوتے تاکہ آنے والی نسلیں انیس کے حضور میں پیش ہوکر ان کی صحیح قدر و منزلت کو پہچانتیں اور دیس و پردیس سے لوگ آتے اور ان کے مزار پر نذر عقیدت پیش کرتے۔ اب شاید وقت آگیا ہے کہ زندہ دلان لکھنؤ اس طرف متوجہ ہوں۔ ہر سال یوم انیس منانے کی بھی

ضرورت ہے تاکہ اس طرح نوجوان خراج عقیدت پیش کرتے رہیں۔ دبستان دہلی نے بے شبہ انیسؔ و دبیرؔ کی صحیح قدر و منزلت قائم رکھنے میں بڑی مدد کی ہے۔ خدا بھلا کرے بیت الحکمت علی گڈھ کے فاضل رئیس الاحرار سید فضل الحسن حسرتؔ موہانی کا جنھوں نے عرصہ دراز کے بعد اُردوئے معلیٰ کے ذریعہ سیرت حسینؑ پر سحر نگار ادیب منشی امیر احمد علوی کا ایک سیر حاصل مقالہ شائع کیا جس میں پہلی بار کھل کر انیسؔ کے کمال حسن کی داد دی گئی اور روح انیسؔ کو ایسے عنوان سے پیش کیا گیا جسمیں انیسؔ کی شاعری پر خصوصاً روشنی ڈالی گئی اور اُن کے محاسن پر زور دیا گیا۔ کوشش بیکار نہیں گئی۔ نوجوان طبقہ میں ایک تیسرا نسبتاً سمجھدار گروہ پیدا ہوا اور اُس نے سب سے پہلے علامہ انیسؔ کے خدو خال پیش کرنے کی ضرورت محسوس کی۔ سب سے پہلے امجد علی اشہری نے حیات انیسؔ شائع کی۔ دوسری قابل ذکر کتاب واقعات انیسؔ میر مہدی حسنؔ نے شائع کی اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ دونوں ابتدائی کوششیں تھیں لیکن ان میں روح نہ تھی اس لئے ان کا اثر دیرپا نہ رہا۔ ان کتابوں میں انیسؔ کے حالات بیان کئے گئے تھے۔ اور چند مراثی نقل کر دئے گئے تھے اُسی دور میں علامہ شبلی نے موازنہ شائع کیا جسکی اشاعت سے نقد و تبصرہ کی جدید راہیں کھل گئیں۔ انیسؔ کے کلام پر ناقدانہ نظر ڈالی گئی۔ موازنہ کا مزاج تیز تھا۔ تقابل میں ان کا شوخ لیکن متین قلم ضرور بہک گیا اور موازنہ کے رد میں سیکڑوں رسائل شائع کئے گئے۔ لیکن ان تمام رسائل کا مقصد وحید محض شبلی پر اعتراض تھا۔ ہر شخص نے شبلی کو مورد الزام بنا لیا مگر کسی نے انکی ژرف نگاہی کی داد نہ دی۔ مولوی عبد الغفور نساخ نے انیسؔ و دبیرؔ کے اغلاط شائع کئے۔ یہ کتاب اچھی تھی لیکن اب کہیں نظر نہیں آتی۔ اُس کی رد میں مرزا محمد رضا تمنؔر نے تطہیر الاوساخ

شائع کردی اور سید افضل حسین ثابت نے مرزا صاحب کے متعلق مختلف زاویوں سے ایک بے نظیر کتاب شائع کی جو اب بھی ادب پرستوں کیلئے باعث عزت ہے۔ اسی کو کچھ دنوں بعد المیزان متھرا سے شائع ہوئی۔ یہ بھی موازنہ کے رد میں شائع ہوئی تھی۔ کتاب عمدہ تھی خاصی مقبولیت ہوئی۔ اب بازار میں یہ بھی ناپید ہے بعدہٗ واقعات کربلا بھی شائع ہوئی اور سب سے آخر میں سحر نگار ادیب منشی امیر احمد علوی نے یادگار انیس شائع کی جو مولنا صفی کے الفاظ میں "یادگار میں توازن ہے۔ مرثیہ نگاری کی مکمل تاریخ ہے اور اس دور کی ایک ستھری اور عمدہ کامیاب کتاب ہے۔" المیزان میں نسبتاً توازن ہے) فاضل مولف نے دونوں اساتذہ کی ادبی قدور کو قائم رکھا۔ افسوس ناک امر یہ ہے کہ لکھنوی حضرات اپنی ضد پر ابھی تک قائم ہیں۔ یادگار انیس کی اشاعت کے بعد انیسیے اور دبیریے دوبارہ ایک مرکز پر متحد ہوئے۔ اس کتاب میں انیس کا ادبی وقار بہت سنجیدگی سلیقے سے پیش کیا گیا اور سنجیدہ طبقہ کو نسبتاً سکون ہوا۔ اور دونوں جماعتوں کا ادبی خلفشار کسی بڑی حد تک مٹا کر نگار ادیب منشی امیر احمد علوی کی یہ بڑی اہم ادبی خدمت ہے جس کو آسانی سے فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ سید مسعود حسن رضوی نیو تنوی نے روح انیس شائع کی اور اس کتاب کی اشاعت کے بعد دانشوروں نے انیس کے متعلق جدید زاویوں سے سوچنے کی عادت ڈالی۔ لیکن عصبیت کا برا ہو اب بھی جس اعلیٰ معیار پر انیس کو بحیثیت شاعر کے پیش کیا جا سکتا ہے اس پر ابھی تک مطلق توجہ نہیں کی گئی ہے بلکہ اس دور میں ایک ترقی پسند ادیب ڈاکٹر احسن فاروقی نے انیس کے کمال پر بے دردی سے پردہ ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ سید مسیح الزماں جائسی نے البتہ کسی حد تک انیس کے متعلق کچھ انصاف سے لکھنے کی کوشش کی لیکن وہ بھی شبلی سے خوش نہیں ہیں حالانکہ شبلی ہی کا یہ احسان ہے جو انیس پر آج تک کچھ

لکھا گیا۔ لطف کی بات یہ ہے کہ جن نوجوانوں نے اس دور آزادی میں انیس پر تحقیقات کی تکلیف گوارا کی ہے ان کا مطمح نظر یقیناً تنقید نہیں ہے بلکہ بجائے انیس کے اکثر ناقدین کرام نے انیس سے زیادہ شبلی پر توجہ کی ہے اور جوش عصبیت میں موازنہ پر اعتراضات کی بوچھار کی ہے۔ قلق تو اس امر کا ہے کہ یہ اعتراضات بالعموم اس کمیں گاہ سے عائد کئے گئے ہیں جو بفضلہ مغربی علوم وفنون سے آراستہ ہے اور عوام صحیح طور پر یہ توقع رکھتے تھے کہ یہ تعلیم یافتہ حضرات انیس کا صحیح مقام ومرتبہ انگریزی ادب کی روشنی میں آسانی سے متعین کر لیں گے لیکن ایسا نہ ہوا۔ ہمارا یہ دعویٰ ہے کہ انیس کا کسی مخصوص جماعت یا برادری سے کوئی تعلق نہیں ہے صحیح تو یہ ہے کہ انیس ایک ادبی ورثہ ہے ضرورت ہے ہم اس کو قائم رکھیں اور ہر شخص کے لئے انیس کا کلام آج بھی موجود ہے۔ کسی مخصوص جماعت یا کسی مخصوص مذہب کی ملک نہیں ہے جو اس طرف متوجہ ہوگا وہ بقدر ظرف وبقدر ذوق روح انیس سے ضرور مستفید ہوگا۔ اگر فردوسی ایران کا ہے ملٹن انگلستان کا تو انیس ہندوستان کا ہے اور اسی روشنی میں ہم کو انیس کے کلام پر نقد وتبصرہ کی ضرورت ہے۔ انیس کے مداحوں نے لکھنوی وغیر لکھنوی شوشہ چھوڑ کر انیس کے قومی وقار کو سخت دھکا لگایا۔ اسی وجہ سے غالباً آج تک نہ تو کسی نے انیس پر سنجیدگی سے تحقیقات کی تکلیف گوارا کی اور نہ کوئی عمدہ ومعیاری کتاب اب تک اس دور میں شائع ہو سکی۔ اب تک انیس پر جو کچھ لکھا گیا وہ قطعاً تشنہ ہے اور اس تمام سرمایہ میں عصبیت کا عفریت مسلط ہے۔ شاید بیت الحکمت علی گڈھ کے سبوت اس طرف متوجہ ہوں۔ اسی ضرورت کو مدنظر رکھتے ہوئے آج بدلے ہوئے حالات میں انیس پر ایک بے لاگ تبصرہ پیش کرنے کی سعی کی گئی ہے شاید پسند آئے۔ مولانا حالی نے خود فرمایا ہے کہ

اردو کو راج چار سو تیرا ہے — شہروں میں رواج کو بکو تیرا ہے
پر جب تک انیس کا سخن باقی ہے — تو لکھنؤ کی ہے لکھنؤ تیرا ہے

تعارف و تاریخ مرثیہ

مرثیہ کی تعریف | مرثیہ کا لفظ رثا سے مشتق ہے جس کے لغوی معنی مرنے والے کی تعریف و توصیف کے ہیں۔ اصطلاح شعراء میں وہ صنف سخن ہے جس میں کسی مردہ شخص کی تعریف اور خوبیاں، حسرت و اندوہ رنج و غم کے ساتھ بیان کی جائیں۔ اور اس کی وفات پر اظہار ماتم کیا جائے۔ یوں تو مرثیہ ہر ایک مصیبت اور تباہی پر کہا جا سکتا ہے اور صرف اشخاص و افراد کے لئے ہی نہیں بلکہ قوم و ملک کی خستہ حالی و تباہی پر بھی کہا جاتا ہے اور اکثر شعراء نے کہا بھی ہے لیکن اردو شاعری میں مرثیہ کا اطلاق زیادہ تر واقعات کربلا پر ہوتا ہے۔ اس لئے مرثیہ کے اصطلاحی معنی یہی رہ گئے کہ واقعات کربلا یعنی حضرت امام حسین اور دیگر شہدائے کربلا کی شہادت اور اس سلسلہ میں ان پر جو مصائب پڑے، جس طریقہ سے انھوں نے مقابلہ کیا، ان سب کا ذکر کیا جائے گویا "مرثیہ اور واقعات کربلا" لازم و ملزوم ہو گئے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ اردو شاعری میں مرثیہ کو جو مقبولیت حاصل ہوئی وہ کسی اور صنف کو نہیں ہو سکی۔

مرثیے ہر صنف سخن میں لکھے گئے۔ اس کی کوئی شکل متعین نہیں تھی، اور نہ اب ہے، لیکن زیادہ تر مرثیے مسدس میں لکھے گئے، اس سے پہلے، مربع، قطعہ، ترکیب بند، ترجیع بند، مخمس، مثنوی، غزل، سب میں مرثیے لکھے گئے مگر مقبولیت زیادہ تر مسدس میں ہوئی۔

اجزائے مرثیہ | ۱۔ تمہید، ۲۔ سراپا، ۳۔ رخصت، ۴۔ آمد، ۵۔ رجز، ۶۔ واقعات جنگ (جس میں گھوڑے، تلوار اور اسلحہ جنگ کا بیان اور ان کی تعریف.

ہوتی ہے) ۷۔ شہادت، ۸۔ بین، (۹) دعا۔

مرثیہ کے ساتھ ساتھ رباعیات اور سلام بھی لکھے جاتے تھے (ان کا ذکر علیحدہ باب میں کیا جائے گا)

مرثیہ کی مقبولیت کے اسباب مرثیہ کی مقبولیت کا سب سے بڑا سبب تو یہی ہے کہ ہر انسان کو کسی نہ کسی کا ماتم کرنا پڑتا ہے، دنیا میں شاید ہی کوئی شخص ایسا ہو جس نے کسی کی موت کا صدمہ نہ اٹھایا ہو، رنج و غم کے عالم میں مرنے والے سے متعلق کچھ الفاظ نہ کہے ہوں، شاعر کا دل سب سے زیادہ حساس ہوتا ہے وہ ان صدمات کو جب بیان کرتا ہے تو سننے والوں کا کلیجہ شق ہو جاتا ہے۔ درد و غم کا راج ہر دل پر ہے، ہمارے بہترین نغمے وہی ہیں جن میں رنج و الم کی فراوانی ہو، یہ انسانی فطرت ہے کہ حسرت و رنج و الم کی کہانی، عیش و طرب کے نغموں سے زیادہ موثر اور دیرپا ہوتی ہے، اس لئے مرثیہ کا تعلق ہر شخص سے قلبی اور بنیادی ہے۔

اس قلبی اور بنیادی تعلق کے ساتھ ساتھ مرثیہ میں مذہبی رنگ اور عقیدت پیدا ہو جانے سے، اس کی شہرت میں چار چاند لگ گئے، شاہان اودھ کی سرپرستیوں نے گھر گھر ماتم کدہ بنا دیا، شہدائے کربلا سے عقیدت نے ہر گھر میں مجلس عزا بپا کرائی، واقعہ کربلا بجائے خود اتنا دردناک ہے کہ انسان تو انسان پتھر کا کلیجہ بھی شق ہو جاتا ہے، پھر جب ضمیر و خلیق، انیس و دبیر جیسے مرثیہ گو اس کو بیان کریں، تو لوگوں کے دلوں پر کیوں نہ اثر ہو، اور کیوں نہ وہ، حزن و رنج و ملال کی صورت، ہو جائیں۔

مرثیہ کو مقبولیت ادبی اعتبار سے بھی ہوئی۔ اردو میں کوئی ایسی صنف نہیں تھی جس میں ہر قسم کے خیالات و جذبات کا اظہار کیا جا سکتا۔ میر ضمیر نے مرثیہ میں یہ صلاحیت

دیکھی کہ وہ اظہار جذبات کے لئے مناسب اور وسیع صنف ہے۔ اس لئے انھوں نے مرثیہ میں اضافہ کیا۔ اس کو المیہ دائرہ سے نکال کر، مرثیہ اور رزمیہ دائرہ میں داخل کرکے، رزم و بزم کا بیان بڑی خوبی سے کیا۔

یہ بات مرثیہ میں بدرجہ اتم موجود ہے کہ اس میں 'اخلاقیات' کا کافی ذخیرہ ہے، اخلاقی شاعری جتنی مرثیہ میں پائی جاتی ہے، وہ دوسری صنف سخن میں نہیں ملے گی، خود اس کا علیحدہ ذکر بہت کم ملے گا۔ اس شاعری کا اثر اس لئے اور بھی زیادہ ہوا کہ وہ شہدائے کربلا کے ساتھ ساتھ لکھی گئی۔

گویا مرثیہ سے 'کونین کی دولت ملتی تھی' دین و دنیا دونوں کے حصول میں آسانی تھی۔ ادبی اور اخلاقی اعتبار سے بھی مرثیہ کی مقبولیت بہت ہوئی۔

مرثیہ کی خوبیاں ادب اور شاعری کے اعتبار سے مرثیہ نہایت کارآمد اور اہم صنف سخن ہے، وہ اُردو شاعری کی ایک بہت بڑی کمی کو پوری کرتا ہے یعنی رزمیہ نظم (EPIC POETRY) کا قائم مقام ہے۔ صبر و تحمل، شجاعت و عالی ہمتی، عفت و عصمت، رحم و انصاف، عزم و حوصلہ، لڑائیوں کے ہو بہو نقشے، مبارزوں کی پُرجوش رجز خوانیاں، مخالفین کے جوابات، کمزوروں کی اعانت و مدد، عزت نفس یہ سب چیزیں مرثیہ کی بدولت اُردو شاعری میں آئیں۔

۲۔ مرثیہ کا سب سے بڑا اعجاز یہی ہے کہ وہ لکھنؤ کی (دور اولین) کی مصنوعی اور مخرب اخلاق شاعری میں پرورش پاکر بام عروج پر پہنچا، وہ اعلیٰ جذبات کو برانگیختہ کرتا ہے۔ اس کا مضمون اعلیٰ اور مقدس ہوتا ہے اس لئے وہ ایک اعلیٰ اخلاقی نظم

۳۔ شاعری کے اصل عناصر دو ہیں تخیل اور محاکات، مراثی ان دونوں عناصر

کا مکمل نمونہ ہیں اس میں آزادی سے تخئیل اور محاکات دونوں سے آزادی سے کام لیا گیا ہے اور اس میدان میں مرثیہ نگاروں نے اپنے اپنے کمالات کے جوہر دکھائے ہیں اور ادب میں ان کا مستقل مقام بھی ہے۔

۴۔ مرثیہ میں جذبات، کردار اور منظر نگاری سے خوب کام لیا گیا ہے اور اسی کے ساتھ مذہبی اور غیر مذہبی واقعات، اخلاقی اور تاریخی واقعات کو بھی بڑی خوبی سے بیان کیا گیا ہے، جس سے اردو شاعری کے محدود دامن میں خاصی وسعت ہوگئی ہے۔

۵۔ مرثیہ میں واقعات کا تسلسل اور عملی جذبات کا اظہار بدرجہ اتم موجود ہے۔

۶۔ ادبی حیثیت سے بھی مرثیہ سے بہت فائدے پہنچے۔ روزمرّہ، محاورہ، صنائع لفظی و معنوی، حسن بیان، جدّت ادا، مناظر قدرت، جذبات فطرت اور واقعہ نگاری سب بہتر سے بہتر صورت میں مرثیوں کے اندر موجود ہیں۔ زبان کی صفائی اور پاکیزگی کی طرف بھی مرثیہ نگاروں نے خاص توجہ کی۔ میر انیس کی زباندانی مسلّم تھی اور انھوں نے صحت زبان کا خاص خیال رکھا اور ان کے متبعین نے بھی اس طرف توجہ کی۔

۷۔ مرثیوں ہی کی بدولت مسدّس کو مقبولیت ہوئی اور اس کا اثر یہ ہوا کہ اسی صنف میں پُرجوش فطری نظمیں لکھی جانے لگیں، حالی، آزاد، چکبست، سرور وغیرہ سب کو مرثیہ ہی کے دامن میں پناہ لینا پڑی ہے۔ دورِ حاضر کی نیچرل نظمیں مرثیہ ہی کی خوشہ چین ہیں کیونکہ مرثیوں میں وہ تمام خصوصیات بدرجہ اتم پائی جاتی ہیں جو آجکل کی نیچرل نظموں میں ملتی ہیں اور جن حقائق کو ترقی پسند طبقہ پسند کرتا ہے۔

۸۔ مرثیہ کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ اس نے اردو شاعری کے محدود میدان کو نہ صرف وسیع ہی کیا بلکہ بعض حیثیتوں سے اسے اس قابل بنا دیا کہ وہ دنیا کی

سے فخر کے ساتھ آنکھ ملا سکے خصوصاً رزمیہ شاعری، تو مرثیہ ہی کی بدولت اردو میں آئی۔

اُردو مرثیہ کی تاریخ مرثیہ کی تاریخ بہت پرانی ہے، یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ مرثیہ گوئی کا آغاز کب ہوا، لیکن بقول نواب نصیر حسین خیال "شمالی ہند میں ہمایوں کی ایران سے واپسی اور شاہ طہماسپ صفوی سے تعلقات قائم ہونے سے پہلے مجالس عزا کا دستور نہیں تھا، عہد جہانگیری میں سب سے پہلے شجاع الدین نوری نے مرثیہ گوئی میں نام پیدا کیا، مرثیہ کے پہلے دور کا باقاعدہ آغاز اسی زمانہ سے ہوا، گو ایک طبقہ اس سے پہلے مرثیہ کے وجود کا قائل ہے چنانچہ خسرو کا مرثیہ اس[1] سے پہلے رائج تھا۔

پہلا دَور مرثیہ گوئی کی ترویج و اشاعت میں دکن کا بڑا حصہ ہے۔ عادل شاہی اور قطب شاہی حکومتیں مرثیہ کی سرپرستی کرتی تھیں، محمد قلی قطب شاہ (متوفی سنہ ۱۰۲۰ھ) سلطان محمد قطب شاہ (متوفی سنہ ۱۰۳۵ھ) اور عبداللہ قطب شاہ (متوفی سنہ ۱۰۸۳ھ) خود سخن سنج و سخن فہم، جوہر شناس تھے، انھوں نے فارسی آمیز دکنی اُردو میں اپنا کلام مرتب کیا۔ بیجاپور اور گولکنڈہ میں شاہی عاشور خانے موجود تھے اور سلطان ان میں بہ نفس نفیس شریک ہوتے تھے۔ اہلبیت اطہار کے غم میں آنسو بہانا ان کا عین ایمان تھا، محمد قلی قطب شاہ کے کلام کا نمونہ یہ ہے۔

سارا تو مدح نبیؐ و علیؑ کی کہتا ہے — معنی شعر ترا تو لکھے ہیں دست بدست
آیت قرآن نازل جیوں ہوا حضرت کے تئیں — مرتضیٰ ہیں بس دو جگہ میں جیوں محمدؐ بے نظیر

---

[1] یہ مرثیہ سلطان نظام الدین اولیاؒ کے وصال کی خبر سن کر خسرو نے کہا تھا۔ افسوس یہ ہے کہ اس مرثیہ کے چند بند بھی اب قوالوں کو یاد نہیں ہیں۔ گو خسرو کا بیشتر کلام قوالوں ہی کی بدولت زندہ ہے۔

اس عہد کے شعرا میں ہاشم علی برہان پوری، رام راؤ سیتوا، کاظم علی، نصرتی، غواصی، نوری اور مرزا زیادہ مشہور ہیں۔ ہاشم اور کاظم کے مراثی ایڈنبرا یونیورسٹی میں اب تک محفوظ ہیں، ان کے کلام کا نمونہ یہ ہے۔ ہاشم

زہر دے مارے حسنؑ کون مکر سیں　　سبز تھا وہ چہرۂ گلفام کا

کربلا میں تھا حسینؑ ابنِ علیؑ　　آج لگ ہے گا انھیں ایام کا

کاظم:۔　اے نابکاراں دین کا چتھر گرانا کہاں روا

سرور نبی کی آل کو یوں دکھ میں لانا کہاں روا

میرزاں نامی ایک پاک طینت بزرگ تھے جنھوں نے عمر بھر حمد و نعت و منقبت کے علاوہ دوسری چیزوں سے اپنی زبان کو آلودہ نہیں کیا۔

گولکنڈہ کا آخری تاجدار شعر و سخن کا بڑا قدرداں تھا، اس کے مصاحبوں میں شاہ قلی خاں مرثیہ گوئی میں نہایت مشہور ہوئے، انکے مرثیوں نے دکن کی حدود سے نکل کر، ہندوستان میں لکھنؤ، دہلی اور آگرہ میں بھی قبول عام کا شرف حاصل کیا، میر حسن نے اپنے تذکرے میں لکھا ہے کہ

"بیشتر مرثیہ می گفت، در ولایت ہندوستان دست بدست می آورد ند"۔

ان شعراء نے نظم و نثر کی مخلوط عبارتوں میں بھی مرثیے لکھے بعض ان میں بہت نمایاں ہیں۔

روضۃ الشہدا، قصہ حسینی عزیز، دوازدہ مجلس، ریاض الخیال وغیرہ اس عہد کے دکنی مرثیہ کی خصوصیات حسب ذیل کتابیں مانی جاتی ہیں۔

ا۔ مذہبی فریضہ سمجھ کر واقعات کربلا پر مرثیے لکھے جاتے تھے۔

۲۔ ادبی شان و لطافت مرثیوں میں بہت کم ہے۔

۳۔ زبان سادہ اور سلجھی ہوئی ہے۔

۴۔ مرثیے مختصر ہیں اور ان میں فرضی روایات بہت کم ہیں۔

۵۔ مرثیوں کی کوئی شکل متعین نہیں تھی، مربع، مثنوی، مثلث، قطعہ سب میں مرثیے لکھے جاتے تھے۔

۶۔ مثنوی، قصیدہ اور غزل کے مقابلہ میں دکنی مرثیہ ادبی اعتبار سے بہت معمولی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کے تحفظ کی طرف کوئی توجہ نہیں دی گئی اور دکنی شعراء کے مرثیہ خال خال ملتے ہیں۔

۷۔ مرثیوں میں دوسرے اصناف سخن کی طرح استعارات و تشبیہات، لطیف کنائے، مبالغہ اور صنائع و بدائع نہ ہونے کے برابر ہیں۔

دکن کے بعد مرثیہ شاہ قلی خاں شاہی کی بدولت دہلی اور آگرہ میں رائج اور مقبول عام ہوا۔ اور اس نواح کے شعراء کو بھی مرثیہ کی طرف توجہ کرنی پڑی۔ بقول پروفیسر احتشام حسین بارہویں صدی ہجری کے نصف آخر میں بکثرت مرثیے لکھے گئے، میر آماقی، میر عاصمی، میر آل علی، درخشاں، سکینی، حزیں، مصطفیٰ خاں یکرنگ، نگین، سعدی کاکوروی، گدا، سکندر، صبر، قادر، گمان، ندیم سب نے مرثیہ گوئی اور مرثیہ خوانی میں شہرت حاصل کی۔ ولی نے شہدائے کربلا کے حال میں ایک مثنوی صاف ستھری زبان میں لکھی۔ مثنوی کا خاتمہ ان دو اشعار پر ہوتا ہے۔

ہوا ہے ختم جب یہ درد کا حال   تھا گیارہ سو پہ اکتالیسواں سال
کہا ہاتف نے یہ تاریخ معقول   ولی کا ہے سخن حق پاس مقبول

بقول پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب "یہ ابتدائی دور تھا اور اسمیں مرثیہ گوئی نے صوری اور معنوی دونوں حیثیتوں سے گو کوئی نمایاں ترقی نہیں کی لیکن یہی کیا کم ہے کہ اس صنف سخن پر توجہ کی گئی۔ گو اس کا کوئی خاص رنگ اور مخصوص انداز قائم نہ ہو سکا عام طور پر کبھی غزل کی صورت میں، کبھی مربع کی شکل میں مرثیے لکھے گئے اور عرصہ تک یہی رنگ سخن قائم رہا۔

میاں مسکینؔ۔

قضا نے کربلا میں جب نظر ثانی مقدر کی ۔۔۔ کہ تا دیکھوں جمالات شباہت ابن حیدر کی
پکڑ کر اپنے ہاتھوں میں قلم شمشیر و خنجر کی ۔۔۔ کہا منظور ہے سب فوج یہ سبط پیمبر کی

ایک طریقہ یہ بھی تھا۔ مصطفیٰ خاں یکرنگ

زخمی برنگ گل ہیں شہیدان کربلا ۔۔۔ گلزار کی نمط ہے بیابان کربلا
اندھیر ہے جہاں میں کہ اب شامیوں کے ہاتھ ۔۔۔ دھو ہاتھ زندگی سیتی مہمان کربلا

دوسرا دور قصیدہ کی طرح مرثیہ کی ادبی حیثیت بھی سوداؔ ہی کے دم سے قائم ہوئی۔ سوداؔ، میر تقی میرؔ اور دوسرے شعرا نے مرثیے لکھے۔ صاحب یادگار انیس منشی امیر احمد علوی نے لکھا ہے کہ سوداؔ کے ہم عصر میاں سکندر پنجاب کے رہنے والے تھے لکھنؤ میں آکر سکونت اختیار کر لی تھی۔ انھوں نے ایک دردناک مرثیہ مسدس میں لکھا جو آج تک مقبول ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اردو زبان میں یہ پہلا مسدس ہے لیکن بعض حضرات حیدر شاہ نامی ایک شاعر کو پہلا مسدس لکھنے کا بانی سمجھتے ہیں جنھوں نے احمد شاہ بادشاہ دہلی کے زمانہ میں وفات پائی۔ ذیل کا بند ان کے نام سے مشہور ہے۔

عزیزو آج ناموس نبی پر آفت آئی ہے ۔۔۔ شب رخصت ہے بتول شہ دیں کی جدائی ہے
خصوصاً بی بی بانو نے عجب حالت بنائی ہے ۔۔۔ سرہانے بی سکینہ کے کھڑی دیتی دہائی ہے

منہ اس کا چومتی ہے اور یہی کہہ کہہ کر روتی ہے
اری اُٹھ لاڈلی میری، غضب کی صبح ہوتی ہے

قبولیت عام کا شرف میاں سکندر کے مرثیہ کو حاصل ہوا۔ سودا کا مرثیہ ان کے دیوان میں آج تک مقید ہے اور سکندر کا مرثیہ بچہ بچہ کی زبان پر ہے۔ میاں سکندر کا یہ خلوص تھا کہ انھوں نے مرثیہ کی وہ شکل اختیار کی جو بعد میں مرثیہ کے لئے مخصوص ہو گئی۔ اور جس عمارت کی داغ بیل انھوں نے ڈالی اس کو انیس و دبیر اور دوسرے مرثیہ گو شعرا نے ثریا تک پہنچا دیا۔" جعفر علی حسرت نے بھی مرثیہ پر زور دیا لیکن ان کے مراثی مشہور نہ ہو سکے۔

مرزا سودا نے مربع اور مسدس دونوں میں مرثیے لکھے لیکن قصیدہ کا یہ شہنشاہ مرثیہ گوئی کے میدان میں کامیاب نہ ہو سکا، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ المیہ مضامین مرزا سودا کے لئے ناموزوں تھے۔ ان کا بہترین مرثیہ یہ ہے۔

یارو سنو تو خالقِ اکبر کے واسطے — انصاف سے جواب دو حیدر کے واسطے
وہ بوسہ گہ نبی تھی پیمبر کے واسطے — یا ظالموں کی برّش خنجر کے واسطے
یا مرتضیٰ علی ولی حشر کا قیام — جس روز ہو عوض کئے رکھے ہے یہ غلام
سودا کو بھول یو نہ تو اپنے زفیض عام — دریائے العطش کے شناور کے واسطے

مرزا سودا کے مسدس کا نمونہ یہ ہے:۔

کس سے اے چرخ کہوں جا کے تری بیدادی — جو ہے دنیا میں سو کہتا ہے مجھے ایذا دی
ہاتھ سے کون نہیں آج ترے فریادی — یاں تلک پہنچی ہے ملعون تری بیدادی
کون فرزند علی پر یہ ستم کرتا ہے
کیوں مکافات سے اسکے تو نہیں ڈرتا ہے

خویش و فرزند و عزیز اسکے تھے جتنے پیارے   دشنہ و تیغ سے ہیں ظالموں کے سب مارے

اہل بیت اس کے جو باقی ہیں سو ہیں آوارے   قید میں کوفیوں کے جاتے ہیں وہ بیچارے

نہ انھیں چین ہے دن کو نہ انھیں رات آرام

اس مصیبت میں چلے جاتے ہیں کربل سے شام

میر تقی میر نے بھی مرثیہ لکھے لیکن بقول علامہ عبدالباری آسی حیرت کی بات یہ ہے کہ میر جیسا پیکر حزن و ملال 'مرثیہ گوئی میں' اظہار رنج و غم' اپنے اسلوب میں نہ کرسکا، کربلا جیسا دردناک واقعہ اور میر صاحب جیسا مصور غم' درد و اثر پیدا نہ کرسکے' سمجھ میں نہیں آتا' یا تو میر صاحب مرثیہ کو بقول سید انشاد "بگڑا شاعر مرثیہ گو" اپنے لئے شایان شان نہیں سمجھتے تھے اور بگڑا شاعر بننا پسند نہیں کرتے تھے' یا پھر انھوں نے جو کچھ بھی کہا محض تفنن طبع' کے لئے کہا ورنہ میر کے مرثیوں میں درد و اثر کوٹ کوٹ کے بھرا ہونا چاہئے۔ بہرحال ان کے کلام کا نمونہ یہ ہے۔

دل پر محبتوں کے حالت عجب ہے   مصیبت ہے ماتم ہے غم ہے تعب ہے

غرض کیا کہوں کس روش کا غضب ہے   حسین علی کی شہادت کی شب ہے

بجا ہے کہ لوہو کے دریا بہائے   یہ کشتی فلک کی لہو میں ڈبائے

شہ تشنہ لب کا کسے غم سنائے   یہ کس منہ سے کہیے کہ وہ تشنہ لب ہے

اس دور میں سودا کا نام سر فہرست ہے' ان کے کلیات میں اکیانوے مرثیہ ہیں ان میں سے چند ان کے شاگرد مہربان کے ہیں باقی سب سودا کے ہیں۔ مرزا سودا اس فن کو مشکل سمجھتے تھے' اسی لئے انھوں نے مرثیہ کو "مشکل ترین دقائق" کہا ہے۔ سودا کے مرثیوں میں حسب ذیل خصوصیات ہیں:۔

۱۔ مرثیہ کی صورت میں اصلاح کی، ان سے پہلے غزل نما، مثنوی نما اور چومصرعہ مرثیوں کا رواج تھا، انھوں نے منفرد، مستزاد، مثلث، مربع، مخمس، ترکیب بند، مسدس وغیرہ میں مرثیے لکھے۔

۲۔ واقعات کربلا کو مسلسل اور ترتیب کے ساتھ بیان کیا۔

۳۔ مرثیہ میں تمہید کا اضافہ کیا۔

۴۔ باوجود فنی کوتاہیوں کے منظر نگاری، کردار نگاری کی بعض اچھی مثالیں انکے مرثیوں میں موجود ہیں۔

۵۔ تشبیہات و استعارات کا برمحل استعمال کیا ہے۔

۶۔ عربوں کا کردار، ہندوستانی معاشرت کے پس منظر میں پیش کیا ہے۔

۷۔ اکثر مرثیے بین اور نوحہ پر ختم ہیں۔

۸۔ سلام بکثرت لکھے ہیں، اس لئے یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ سلام، لکھنوی مرثیہ گویوں کی ایجاد ہے۔ سوداؔ نے مختلف صورتوں میں بھی مربع اور غزل نما سلام لکھے ہیں۔

۹۔ اُردو کے علاوہ پوربی اور پنجابی زبانوں میں بھی مرثیے کہے ہیں۔

باوجود ان تمام خوبیوں کے، سوداؔ کے مرثیوں میں وہ زور و اثر نہیں ہے جو انکے قصائد میں پایا جاتا ہے ان کے مرثیوں میں ایمانداری کی بات یہ ہے ادبی شان بھی انکے شایان شان نہیں ہے، اس لئے ان کے زمانہ میں ان کی مرثیہ گوئی پر بکثرت اعتراضات ہوتے تھے، جن کا ذکر انھوں نے خود رسالہ سبیل ہدایت میں کیا ہے۔ لیکن ان مرثیوں میں ایسے بند بھی ہیں جو درد و اثر سے بھرے ہوئے ہیں لیکن اصل یہ ہے کہ وہ اس کے لئے وضع ہی نہ کئے گئے تھے۔

جو خصوصیات مرزا سودا کے مرثیوں میں پائی جاتی ہیں کم و بیش وہی خصوصیات اس دور کے دوسرے باکمال شعرا کے یہاں بھی پائی جاتی ہیں۔ بہرحال مرثیہ کا یہ دور روشن مستقبل کی خبر دے رہا ہے۔ میاں سکندر اور مرزا سودا کے مرثیے زبان زد خاص و عام تھے، اب بڑا شاعر مرثیہ گو کو غلط سمجھا جانے لگا تھا اور مرثیہ گوئی کو فنی اور ادبی حیثیت حاصل ہوتی جا رہی تھی، شعراء کا عام رجحان مرثیہ گوئی کی طرف ہوتا جا رہا تھا۔ اس رجحان کے اسباب خواہ مذہبی ہوں یا دنیوی مفاد، یا شاہان اودھ کی سرپرستی لیکن حقیقت یہی تھی کہ "مرثیہ گوئی" عام ہوتی جا رہی تھی، اور شعراء مرثیے لکھنا باعثِ سعادت و برکت سمجھتے تھے اور اس پر فخر کرتے تھے۔

تیسرا دور اس دور میں میر مستحسن خلیق، میر مظفر حسین ضمیر، میاں دلگیر اور فصیح بہت نمایاں۔ میر خلیق اور میر ضمیر کو مرثیہ گوئی میں جو شہرت حاصل ہوئی وہ میاں دلگیر اور فصیح کو نہ ہو سکی۔ گو اس زمانہ کے بعض ارباب کمال میاں دلگیر سے زیادہ محبت کرتے تھے، مرزا رجب علی بیگ سرور نے فسانہ عجائب میں لکھا ہے:۔

"مرثیہ گو بے نظیر، میاں دلگیر، صاف باطن، نیک ضمیر، خلیق، فصیح، مرد مسکین، مکروہات زمانہ سے کبھی افسردہ نہ دیکھا"

اسی طرح شیخ ناسخ نے دلگیر کے لئے لکھا ہے۔

متحد ایسے زمانے میں کہاں ہوتے ہیں   آپ دلگیر ہے ناسخ جو ہے دلگیر جدا

میاں دلگیر کے کلام میں درد و اثر کوٹ کوٹ کر بھرا ہے، یہ نہایت پُرگو اور قادر الکلام شاعر تھے۔ تقریباً پچانوے ہزار شعر کا سرمایہ چھوڑا ہے۔ شاعری میں ناسخ کے شاگرد تھے، زبان کی صفائی اور بندش کی چستی پر زیادہ زور دیتے تھے۔ ان کے

مرثیوں میں بین زیادہ ہے، سلام اور نوحے بھی انھوں نے لکھے ہیں۔

میاں دلگیر کا کلام گریہ و بکا کے لئے تو موزوں ہے لیکن فنی اعتبار سے ان کا پایہ میر خلیق سے بلکہ میر ضمیر سے بھی پست ہے۔

مرثیہ میں انھوں نے کوئی جدت نہیں پیدا کی، بلکہ میر ضمیر کے نقش قدم پر چلے اور انھیں کا اثر قبول کیا۔ انھوں نے شاعرانہ صناعی کو بہت کم ملحوظ رکھا اور مرثیہ کی طرف محض توجہ حصول ثواب اور اپنے زمانہ کے رسم ورواج کے خیال سے کی۔ تاہم ان کا کلام صنف مرثیہ میں ایک خاص مقام ضرور رکھتا ہے۔

میاں دلگیر کے بعد فصیح کا نام قابل ذکر ہے۔ یہ بھی ناسخ کے شاگرد تھے اور دلگیر سے مشورہ سخن کرتے تھے۔ فصیح نے "زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ ساز" پر عمل کیا اور رزمیہ بیان مرثیوں میں شامل کرنے لگے، مگر شوق زیارت اور تمنائے حج نے انھیں لکھنؤ چھوڑنے پر مجبور کیا۔ نیت کا خلوص کہا جائے یا قسمت کی خوبی کہ دیار حبیب صلعم میں اقامت اختیار کر لی مگر مشق سخن جاری رہی۔ انھوں نے مکہ معظمہ میں ایک نہایت پُرزور سلام کہا اور لکھنؤ بھیجا، یہ سلام مقبول خاص و عام ہوا، حرم پاک میں لکھا ہوا یہ سلام دل والے پڑھتے اور وجد کرتے ہیں۔ آج بھی اس کی مقبولیت میں کوئی کمی نہیں ہوئی۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

سلام لکھتا ہوں میں حرم میں قلم سے زمزم ٹپک رہا ہے
سر اپنا کعبہ کے سنگ در پہ سیاہ پردہ پٹک رہا ہے

گھرے ہیں بادل سے شام کے دل کھنچی ہے حیدر کی سیف برّاں
گھٹا میں بجلی چمک رہی ہے زمانہ آنکھیں جھپک رہا ہے

سکینہ پیاسی تڑپ رہی ہے، پڑی ہے بیہوش بنت مسلم
ادھر کو اصغر سسک رہا ہے اُدھر کو باقر بلک رہا ہے

کہا یہ عابد نے ماں سے رو کر بچے نہ اصغر رہا میں زندہ
لگا گلے میں جو تیر اُن کے جگر میں میرے کھٹک رہا ہے

خدا مظفر حسین خاں کو بخیر و خوبی حرم میں لائے
فصیح مشتاق اسقدر ہے کہ راہ دن رات تک رہا ہے

فصیح کے کلام میں دوسرے مرثیہ گو شعراء کی طرح جذبات نگاری، واقعہ نگاری اور المیہ عنصر کافی موجود ہے، گو ہجرت نے مرثیہ گوئی اور مرثیہ پرستی کی فضا سے انھیں محروم کر دیا تھا تاہم یہ ان کی طبیعت کا تقاضا اور تربیت کا اثر تھا کہ وہ مرثیہ گوئی سے کبھی بھی بے تعلق نہ رہ سکے، اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اپنے ہم عصر مرثیہ گویوں کی طرح کمال تو حاصل نہ کر سکے مگر اور کوئی قابل فخر سرمایہ نہ چھوڑ سکے لیکن جو کچھ بھی سرمایہ انھوں نے چھوڑا وہ سر آنکھوں سے لگانے کے قابل ہے۔ سلام کلام کا نمونہ درج کیا جا چکا، مرثیے کے چند بند یہاں لکھے جاتے ہیں۔

لاش اصغرؑ رن سے لاتے ہیں حسینؑ زخم بازو کا چھپاتے ہیں حسینؑ
پاؤں آہستہ اُٹھاتے ہیں حسینؑ دل سے اپنے کہتے جاتے ہیں حسینؑ
لاش اصغر خیمہ میں جب جائے گی
شہربانو دیکھ کر مر جائے گی

دو قدم چلتے ہیں اور تھمتے ہیں شاہ راست اور چپ لڑکے کرتے ہیں نگاہ
کہتے ہیں نزدیک ہے اب خیمہ گاہ منتظر ہووے گی بانو در پہ آہ
تیر حلقِ نازنیں کے پار ہے
خیمہ تک جانا بہت دشوار ہے

اخلاقی مضامین جو مرثیہ کا طرۂ امتیاز و افتخار ہیں، میاں فصیح کے یہاں بھی موجود ہیں۔ مثلاً حضرت امام حسینؑ میدان جنگ میں جانے سے پہلے اہلبیت اطہار کو تلقین صبر فرماتے ہیں۔

موت سے ظالم و مظلوم نہ پائیں گے اماں ملک الموت کے قبضہ میں ہیں سب پیر و جواں
عمر انساں کی ہے صرصر کی طرح تند رواں ایک دن سب کو اسی خاک میں ہونا ہے نہاں
غم دنیا ہے عبث زیست کے پابندوں کو
چاہیے خالق اکبر کی صدا بندوں کو

جو بلا آئے اُسے سمجھو کہ ہے فضل کریم جانیو ذلت و خواری کو کہ ہے اجر عظیم
قید خانے کو سمجھنا کہ ہے جنات نعیم جب لگے گرم ہوا جانیو جنت کی شمیم
رہیو راضی برضا حکم خدا نازک ہے
دم شمشیر سے بھی راہ رضا نازک ہے

اس عہد میں اصل مقابلہ خلیق اور ضمیر کے درمیان تھا، میاں دلگیر زبان میں لکنت ہونے کی وجہ سے اپنا مرثیہ خود نہیں پڑھتے تھے، اور مرزا فصیح ترک سکونت کر چکے تھے، صرف ضمیر و خلیق کے واسطے مرثیہ گوئی کا میدان رہ گیا تھا، اس لئے یہ دونوں باکمال ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کے لئے کوشش اور کاوش کرتے تھے جس کا نتیجہ مرثئے کی ترقی و تکمیل و توسیع کی صورت میں رونما ہوا۔

میر خلیق میر خلیق، میر حسن کے صاحبزادے تھے، ان کے بزرگوں میں میر امامیؔ اور میر ضاحک نے مرثیے کہے تھے، میر خلیق کو مرثیہ گوئی ورثہ میں ملی تھی، شاعری ان کی فطرت تھی، بچپن ہی سے مشق سخن شروع کر دی، اور خلاق معانی مصحفی کے شاگرد ہو گئے، تھوڑے ہی

عرصہ میں یہ مشّاق ہوگئے اور کلام میں درد و اثر اور سلاست و روانی پیدا ہونے لگی۔
ایک مرتبہ فیض آباد میں مرزا محمد تقی کے یہاں مشاعرہ میں خواجہ حیدر علی آتش کی موجودگی میں
میر خلیق نے شروع جلسہ میں غزل پڑھی جس کا مطلع یہ تھا۔

رشک آئینہ ہے اس رشک قمر کا پہلو صاف ادھر سے نظر آتا ہے اُدھر کا پہلو

تو آتش نے غزل پھاڑ ڈالی۔

میر حسن کی وفات کے بعد میر خلیق نے آخری عمر مرثیہ گوئی میں صرف کی اور غزلوں کو
طاق پہ رکھا، افسوس ہے کہ غزلوں کا دیوان شائع نہ ہو سکا[له]۔ میر خلیق اہل زبان تھے، روزمرّہ
اور محاورہ پر انھیں کمال حاصل تھا، بیگماتی زبان کی ترتیب و تدوین سے وہ متعلق تھے، اسلئے
زبان کی صفائی اور پاکیزگی، روزمرّہ کی صحت اور محاورے کی درستی، بندش کی چستی ان کے
کلام کا جوہر ہیں۔ انھوں نے درد و اثر کو خالی تشبیہوں اور لفظی مناسبت کے مقابلہ میں
زیادہ ملحوظ رکھا، میر انیس کو میر خلیق کی زبان پر ناز تھا، وہ فخریہ کہتے ہیں۔

"حقا کہ یہ خلیق کی ہے سر بسر زباں"

میر خلیق نے رزمیہ مضامین سے احتراز کیا اور اپنے کلام کا جوہر درد و اثر ہی کو سمجھا
انھوں نے میر ضمیر کی طرح مرثیت کے کوچہ سے قدم آگے نہیں بڑھایا اور مرثیہ کا دائرہ واقعاتِ کربلا
کے مصائب بیان کرنے تک محدود رکھا، یعنی صرف رونا، رولانا ہی ان کے مرثیہ کا مقصد تھا۔

میر خلیق کا قیام فیض آباد میں تھا وہ صاحبانِ ذوق کی طلب پر مجلس پڑھنے لکھنؤ
آیا کرتے تھے افسوس ہے کہ ان کا کلام بھی زمانہ کے دستبرد سے محفوظ نہ رہ سکا۔ میر نواب صاحب

له منشی احمد علی مرحوم نے میر حسن کے غزلیات کا ایک مجموعہ انجمن اخوان الصفا کاکوری کو نذر کیا تھا لیکن
افسوس اب تلف ہو گیا۔

نامی ایک بزرگ نے ۱۲۹۷ھ میں گلبرگہ حیدرآباد دکن میں، میر خلیق، مونس، اور انیس کے مرثیوں کا ایک مجموعہ شائع کیا تھا، اس مجموعہ میں میر خلیق کے متعدد مرثیے ہیں لیکن اکثر ان میں وہ مرثیے بھی شامل ہیں جو آج میر انیس کے نام سے مشہور ہیں۔ بعض ایسے ہیں جو زبان اور طرزِ ادا میں، میر انیس کے معلوم ہوتے ہیں اور اگر یہ مرثیے واقعی میر خلیق کے ہیں تو بقول علامہ شبلی باپ پر بیٹے کو ترجیح کی کوئی وجہ نہیں۔

یہ امر مسلمہ ہے کہ میر خلیق کی زبان مستند اور ٹکسالی تھی، انھوں نے صحت زبان کا خاص خیال رکھا، اور یہی ان کا درجۂ کمال ہے، تمام استادانِ فن میر خلیق اور ان کے خاندان کو مستند سمجھتے تھے۔ چنانچہ شیخ امام بخش ناسخ ہمیشہ اپنے شاگردوں سے کہتے تھے کہ "اگر زبان سیکھنا ہو تو خلیق کے گھرانے سے سیکھو"۔

میر ضمیر مرثیہ کی تشکیل نو کے موجد میر ضمیر ہیں، انھوں نے مرثیہ میں وسعت پیدا کی۔ میر ضمیر خاندانی شاعر نہ تھے لیکن شاعری کا ملکہ خداداد تھا۔ طبیعت میں جدت و ندرت تھی، زبان پر بھی کافی عبور تھا تعلیم کا صحیح علم نہیں البتہ یہ اپنے پدر بزرگوار کے ہمراہ فیض آباد سے لکھنؤ چلے آئے تھے مصحفی کے یہ بھی شاگرد تھے، میر ضمیر نہایت زود گو اور پُر گو تھے، کئی ضخیم جلدوں میں ان کے مرثیے شائع ہو چکے ہیں۔ انھوں نے مرثیے میں حسب ذیل جدتیں کیں۔

۱۔ رزمیہ لکھا۔

۲۔ سراپا ایجاد کیا۔

۳۔ گھوڑے، تلوار اور دیگر اسلحہ جنگ کے اوصاف لکھے

۴۔ بندش کی صفائی اور کلام میں زور پر توجہ کی۔

۵۔ جذبات نگاری، منظر نگاری، واقعہ نگاری، ان کے مرثیوں میں مستقل حیثیت رکھتی ہے۔

۶۔ غلط اور متروک الفاظ جو مرثیوں میں استعمال ہوتے تھے، انھوں نے ترک کر دیے۔

۷۔ تشبیہات و استعارات اُن کے یہاں کم ہیں، زبان سادہ، صاف اور سلیس ہے۔

۸۔ لکھنوی شاعری میں اخلاقی شاعری کو مستقل طور پر داخل کرنے کی پہلی کوشش میر ضمیر نے کی۔

۹۔ میر ضمیر مرثیہ گوئی میں پہلے صاحبِ فن اور صاحبِ طرز ہیں اور ان کے کلام میں وہ تمام خوبیاں موجود ہیں جو میر انیس اور مرزا دبیر نیز ان کے جانشینوں میں پائی جاتی ہیں۔

۱۰۔ میر ضمیر پہلے شخص ہیں جنھوں نے مرثیہ کو تحت لفظ ممبر پر بیٹھ کر پڑھا، اس سے پہلے مرثیے سوز کے لہجے میں پڑھے جاتے تھے۔ مرثیہ گویوں کی توجہ بین پر تھی۔

۱۱۔ میر ضمیر نے روایتیں نظم کرنا شروع کیں اور مرثیے کے بندوں کی تعداد ۱۲ سے بڑھ کر پچاس، ساٹھ، ستر، اسی بندوں تک پہنچ گئی، رفتہ رفتہ یہ تعداد سو سے بھی متجاوز کر گئی۔

میر ضمیر نے ایک مرثیہ ۱۰۱ بند کا لکھا جس میں شہزادہ علی اکبر کی شہادت کا بیان کیا ہے جس کا مطلع یہ ہے:۔

کس نور کی محفل میں مری جلوہ گری ہے کس نور سے پُر نور یہ نورِ نظری ہے
آمد ہی میں حیران قیاسِ بشری ہے یہ کون سی تصویر تجلی سے بھری ہے
گو حسن کا رُتبہ نہیں مذکور ہوا ہے
منبر مرا ہم مرتبۂ طور ہوا ہے

اس مرثیہ میں تمہید سے چہرہ باندھا، پھر سراپا لکھا، جو اس سے پہلے مرثیوں میں شامل نہیں تھا۔

قرآن کی تشبیہ یہ اس دل نے بتائی　　پیشانی انور ہے کہ ہے لوح طلائی
ابرو سے وہ بسم اللہ قرآن نظر آئی　　جدول سے کشش زلف کی تار ولے دکھائی
وہ زلف وہ بینی الف لام رقم ہے
یہ میم دہن مل کے یہ اک شکل الم ہے

میدان جنگ کا نقشہ اس طرح کھینچا ہے۔

تھا آب دم تیغ سے طوفان کا اسباب　　تھی موج فنا سر سے گزرتا تھا پڑا آب
دریا تھا وہ لشکر تو ہر اک حلقہ تھا گرداب　　اعضائے بریدہ صفت ماہی بے آب
آبِ دم خنجر پہ علمداروں کے دم تھے
جب تیغ علم کی تو علم صاف قلم تھے

اور بیان شہادت پر خاتمہ کر دیا۔ مقطع میں فرماتے ہیں۔

جس سال لکھے وصف یہ ہم شکل نبیؐ کے　　بارہ سو انچاس تھے ہجرِ نبوی کے
آگے تو یہ انداز سنے تھے نہ کسی کے　　اب سب یہ مقلد ہوئے اس طرز نوی کے
دس میں کہوں سو میں کہوں یہ ورد ہے میرا
اس طرز میں جو جو کہے شاگرد ہے میرا

میر ضمیر کا یہ دعویٰ سچ ہے، اس طرز نوی کی تقلید سب نے کی، اور سب میر ضمیر کے چشمہ سے سیراب ہوئے۔

اس دور میں میر ضمیر نے مرثیہ کو بام عروج پر پہنچا دیا، اس کی حیثیت فنی اور ادبی

اعتبار سے بہت بلند ہوگئی۔ رزمیہ شاعری کی بنیاد ڈال کر اس میں توسیع و ترقی کی، عوام کے مذاق کو اخلاقی شاعری کی طرف متوجہ کر دیا۔ زبان کی صحت و صفائی کی طرف خاص توجہ دی، تشبیہات و استعارات میں جدت و ندرت پیدا کی، مبالغہ آرائی میں بھی کمال حاصل کیا اور مرثیہ کو نہایت کارآمد، مفید اور وسیع صنف بنا دیا۔ اردو شاعری اس پر جتنا ناز کرے کم ہے۔ اس فخر و مباہات کا تمام تر سہرا میر ضمیر کے سر ہے۔ میر ضمیر کی ژرف نگاہی اور دور اندیشی نے فنِ مرثیہ گوئی کو ایسی ترقی دی کہ وہ تمام اصنافِ سخن پر حاوی ہو گیا۔

چوتھا دور اس دور کی ابتداء تو میر ضمیر اور میر خلیق کے زمانہ ہی میں ہو گئی تھی کیونکہ مرزا رجب علی بیگ سرور نے مشہور مرثیہ گویوں میں مرزا دبیر کا بھی نام لیا ہے۔ اس وقت تک میر انیس گوشہ گمنامی میں تھے لیکن میر ضمیر اور میر خلیق کے بعد میر انیس اور مرزا دبیر مرثیہ گوئی کے آسمان پر آفتاب و ماہتاب ہو کر چمکے۔ ان دونوں بزرگوں کو قسام ازل نے غمِ حسین بیان کرنے کے لئے منتخب کر لیا تھا۔ اور لاریب ان کی خداداد ذہنیت و صلاحیت ہی تھی جس نے مرثیہ گوئی کو وہ عروج بخشا جو اس سے پہلے کبھی نصیب ہوا تھا اور نہ اس کے بعد ہوا۔ شاہان اودھ کی مرثیہ نوازی اور محبت اہلبیت نے سونے پر سہاگے کا کام کیا اور صنف مرثیہ میں وہ وسعت و جامعیت پیدا ہو گئی کہ دوسری تمام اصناف سخن اس کے سامنے ہیچ نظر آنے لگیں۔ اردو شاعری صرف مرثیہ کی بدولت اس قابل ہو گئی کہ وہ دنیا کی بڑی سے بڑی ترقی یافتہ زبانوں سے نہایت فخر و مباہات کے ساتھ آنکھیں ملا سکتی ہے۔ بلکہ یہ کیوں نہ کہا جائے کہ صنف مرثیہ کی وسعت و صلاحیت کا جواب دوسری زبانیں بھی پیش کرنے سے قاصر ہیں۔ اردو شاعری کو یہ شرف اور یہ مرتبہ میر انیس

اور مرزا دبیر کے افکار عالیہ کی بدولت نصیب ہوا، تقریباً پانچ چھ لاکھ بیت انیس و دبیر نے کہے ہوں گے، ان میں ہر قسم کے جذبات و خیالات کا اظہار کیا ہے جس سے ہماری زبان میں قابل قدر اضافہ ہوا۔

میر انیس کی مرثیہ نگاری پر تفصیلی بحث آئندہ صفحات میں پیش کی جائے گی۔ یہاں صرف چند اشارے ان کی مرثیہ گوئی کے متعلق کیے جاتے ہیں۔

۱۔ انیس خاندانی مرثیہ گو تھے، مداحی شبیرؑ ان کا قابل قدر ورثہ تھی، خود کہتے ہیں۔

عمر گذری ہے اسی دشت کی سیاحی میں   پانچویں پشت ہے شبیر کی مداحی میں

۲۔ صغر سنی ہی سے شاعری شروع کردی تھی، اور تھوڑے دنوں کی مشق سے درجۂ کمال کو پہنچ گئے تھے۔

۳۔ پہلے حزیں تخلص رکھا تھا لیکن بعد شیخ ناسخ کے مشورہ سے تخلص بدل دیا اور انیس رکھا۔ خصوصیات کلام کے متعلق علامہ شبلی کی رائے کا اقتباس پیش کیا جاتا ہے۔

۱۔ انیس کا کلام فصیح و بلیغ ہے، فصاحت و بلاغت کے تمام محاسن ان کے کلام میں موجود ہیں۔

۲۔ کلام کی اصلی ترتیب قائم رہتی ہے۔

۳۔ مضامین کی نوعیت کے لحاظ سے الفاظ کا حسب موقع استعمال کرتے ہیں۔

۴۔ صحت الفاظ، روزمرہ اور محاورہ کے استعمال پر خاص توجہ دیتے ہیں۔

۵۔ ردیف و قافیہ اور بحر کا انتخاب نہایت خوبی سے کرتے ہیں۔

۶۔ جذبات انسانی، واقعہ نگاری، منظر نگاری بیان کرنے میں خداداد ملکہ ہے۔

۷۔ نادر مگر قریب الفہم استعارات و تشبیہات خوب استعمال کرتے ہیں۔

انیس کے کلام پر اعتراضات بھی ہیں، جن کا ذکر آئندہ صفحات میں علحدہ باب کے تحت کیا گیا ہے۔ بحیثیت مجموعی اُردو شاعری میں انیس کا مرتبہ بہت بلند ہے' ان کا ایک مخصوص مقام ہے۔ وہ صرف ایک مرثیہ گو شاعر ہی نہیں ہیں' بلکہ ان کو رزمیہ' بزمیہ' المیہ اور کسی حد تک طربیہ شاعری پر پورا پورا عبور ہے' فنّی اعتبار سے ان کا کلام بے مثل اور جامع کمالات و صفات ہے' جس میں ہر قسم کے انسانی جذبات کی ترجمانی پائی جاتی ہے۔

مرزا سلامت علی دبیر اپنے استاد کی طرح مرزا دبیر بھی خاندانی شاعر نہ تھے ۱۲۱۸ھ مطابق ۱۸۰۳ء میں دہلی میں پیدا ہوئے' ان کے والد کا نام مرزا غلام حسین تھا بچپن ہی میں اپنے والد کے ہمراہ لکھنؤ آئے اور یہیں کے ہو رہے، مرزا کی استعداد علمی کافی تھی، نہایت ذہین اور طبّاع تھے' بحث و مباحثہ اور درس و تدریس کے بڑے شائق تھے' شعر و سخن سے فطری لگاؤ تھا' اور مرثیہ گوئی سے قدرتی طور پر اُنھیں زیادہ مناسبت تھی۔ میر ضمیر کے شاگرد ہوئے اور تھوڑے ہی عرصہ میں اپنی ذہانت اور طبّاعی کی بدولت اپنے تمام معاصرین پر گوئے سبقت لے گئے۔ یہاں تک کہ ان کا شمار بھی اساتذہ میں ہونے لگا، سرور نے میر خلیق' میر ضمیر کے ساتھ مرزا دبیر کا بھی ذکر کیا ہے' مرزا دبیر میر انیس سے بہت پہلے میدان مرثیہ گوئی میں اُترے اور ان کی ذہانت کے بعد ایک سال تک زندہ رہے۔

میر انیس کے حریف مرزا دبیر ہی تھے۔ لکھنؤ میں دونوں استادوں کے کمالات کا شہرہ تھا۔ انیس اور دبیر کے شاگرد دو بڑے گروہوں میں تقسیم ہو گئے تھے۔ انیس کے شاگرد انیسئے اور دبیر کے دبیریے کہلاتے تھے۔ اپنے اپنے اُستادوں کی مدح سرائی دونوں گروہ کرتے رہتے تھے۔ شعر و شاعری پر خوب خوب بحث و مباحثے ہوتے، بال کی کھال نکالی جاتی' ایک دوسرے کے عیوب ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر نکالے جاتے اور برسرِ مجلس ٹوکے

جاتے، اس سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ زبان درست ہو گئی، ایک ایک لفظ کی صحت پر بحث و مباحثہ
الفاظ کی تراش خراش ہیروں اور نگینوں کی طرح کی جانے لگی، جس سے زبان کی صحت، سلاست،
روانی، فصاحت، بلاغت میں غیر معمولی اضافہ ہوا۔ اُردو زبان سچ مچ کوثر و تسنیم سے
دھلی ہوئی معلوم ہونے لگی، اس کی دلکشی، رعنائی و زیبائی میں اضافہ ہوا۔

مرزا دبیر کے کلام کی خصوصیات مختصراً حسب ذیل ہیں۔

۱۔ زبان پر شکوہ اور انداز بیان باوقار ہے، مرزا دبیر ایسے موضوع بیان کرنے میں
انیسؔ سے بازی لے گئے ہیں جن میں خیالات پُر زور ہوتے ہیں۔ مثلاً معرکہ، جنگ، رزم،
رجز، فخر و مباہات، تلوار کی تعریف وغیرہ۔

۲۔ مرثیہ کے عام مقبول انداز کے بجائے ایک نیا انداز پیدا کیا، اور سوز و گداز
کے ساتھ جوش و ولولہ، عزم و استقلال کو بھی بیان کیا، سوز و گداز کی زبان بھی عام
نہیں رکھی۔

۳۔ مضمون آفرینی اور جدّت و ندرت زیادہ ہے۔

۴۔ تشبیہات و استعارات قریب الفہم نہیں ہیں۔

۵۔ زبان کی صفائی، بندش کی چُستی اور شعر کے ظاہری محاسن دبیر کے کلام میں
بدرجہ اتم موجود ہیں۔

۶۔ رکاکت اور ابتذال سے پرہیز کرتے ہیں۔

۷۔ حقیقت نگاری، جذبات نگاری پر کمال حاصل ہے۔

۸۔ اخلاقی مضامین کی کثرت ہے۔

۹۔ صنعت گری اور خالص رعایت لفظی سے احتراز کرتے ہیں۔

۱۰۔ صدہا نئی ترکیبیں، بندشیں، تشبیہات اور استعارات ان کے کلام میں موجود ہیں۔

مرزا دبیر کے کلام پر اعتراضات بھی کافی ہوئے، ان کی دقت پسندی اور معنی آفرینی نے کلام میں بعض خرابیاں ضرور پیدا کیں، علامہ شبلی نے اپنے موازنہ میں تفصیل کے ساتھ ان کو لکھا ہے، ان کی رائے کا خلاصہ یہ ہے کہ

" فصاحت ان کے کلام کو چھو بھی نہیں گئی، بندش میں تعقید اور اغلاق، تشبیہات و استعارات اکثر دور از کار، بلاغت نام کو نہیں، کسی چیز یا کسی کیفیت یا حالت کی تصویر کھینچنے سے وہ بالکل عاجز ہیں۔ خیال آفرینی اور مضمون بندی البتہ ہے لیکن اکثر جگہ اس کو سنبھال نہیں سکتے۔ بندش سست اور ناہموار ہے، بھدے الفاظ اور بھدی ترکیبیں بکثرت ہیں"۔

لیکن مولانا شبلی نے ان کی دقت پسندی، خیال آفرینی، جدت استعارات، اختراع تشبیہات، شاعرانہ استدلال، شدت مبالغہ کا اعتراف کیا ہے۔ اور اس کا بھی اقرار کیا ہے کہ جہاں ان کا کلام فصاحت و بلاغت کے معیار پر بھی پورا اتر جاتا ہے، نہایت بلند رتبہ ہو جاتا ہے۔

غرض یہ امر مسلمہ ہے کہ مرزا دبیر اپنے فن کے استاد تھے اور میر انیس سے ان کا راستہ جدا تھا۔ یہ صحیح ہے کہ میر انیس کی طرح ان کے کلام کو مقبولیت اور شہرت نصیب نہیں ہوئی لیکن اس سے ان کے کمال پر حرف نہیں آ سکتا۔ ہم آگے چل کر میر انیس اور مرزا دبیر کے متحد المضمون مرثیوں اور اشعار پر بحث کریں گے اس سے ان کے کمال کا اندازہ بخوبی ہو جائے گا۔ ایک خاص فرق انیس اور دبیر کی شاعری میں یہ ہے کہ انیس کی شاعری میں رنگ دہلی کی نمود ہے اور دبیر کی شاعری میں رنگ لکھنؤ جھلکتا ہے۔

مرزا دبیر کا کلام کئی ضخیم جلدوں میں ہے، حق یہ ہے کہ ایسا پُر گو و عالی مرتبت شاعر دنیائے اُردو میں کوئی دوسرا نہیں ہوا۔ عروس سخن کے سنوارنے میں مرزا دبیر نے کچھ کم عرق ریزی نہیں کی۔ مرزا افضل حسین ثابت نے اس سلسلہ میں معترضین کے جوابات بھی دیئے۔

تشبیہات

صف بستہ تھا اس طرح سے شبیر کا لشکر — تسبیح میں جس طرح سے دانے ہوں برابر

تن میں زرہ تھی، خود، سر بے شکوہ پر — وہ زین پر کیں تھا کہ اژدر تھا کوہ پر

ہتھکڑی میں ہے یہ پتلی سی کلائی روشن — یا ہلالِ شب اوّل کے ہے چوگرد گہن

مبالغہ

فوّارے کو نہ حوض میں گرمی سے کل پڑی — پانی کی بھی زبان دہن سے نکل پڑی

تھی اس برس وہ شدّت گرما کہ الحذر — مثل چنار آگ سے جلتا تھا ہر شجر

حسن التعلیل

یہ ہیبت شمشیر کا واں جوش ہوا تھا — جو موجوں سے دریا بھی زرہ پوش ہوا تھا

تن پر کمانیں سہم کے چسپیدہ ہو گئیں — تیغیں سمٹ کے قبضوں میں پوشیدہ ہو گئیں

مراعاۃ النظیر

بارش تھی آب تیغ کی برسات سے فزوں — بدلی تھی فوج شام کی رنگت گھٹا تھا خوں

قبضہ تو رہا تیغ کا دست شہ دیں میں — پھل جا کے لگا شاخ سر گاؤ زمیں میں

ایہام

احمدؐ مدینۂ علم کا در بوتراب ہے — اس باب میں حدیث رسالتمآب ہے

اس نام کے لیتے ہی طبیعت کا بڑھا زور — شیریں سخنی کا مری عالم میں ہوا شور

غرض مرزا دبیر نے بکثرت صنائع بدائع استعمال کئے ہیں۔ لف ونشر مرتب، مہملہ، تلمیح، ترصیع، تنسیق الصفات، سیاقۃ الاعداد، تفصیل، مقابلہ، تضاد کی مثالیں مرزا دبیر کے کلام میں بیشمار مل سکتی ہیں۔

آئندہ اوراق میں مرزا دبیر کے کلام پر میر انیس کے سلسلہ میں بحث کی گئی ہے۔

میر انیس اور مرزا دبیر کے علاوہ حسب ذیل مرثیہ گو شعراء اس دور میں مشہور ہوئے، اور اگرچہ دوسرے مرثیہ نگار بھی اس زمانہ میں موجود تھے لیکن ان کی حقیقی شہرت اس دور کے بعد ہی سے شروع ہوئی اس لئے انھیں پانچویں دور میں شامل کیا جائے گا۔

مرزا انس مرزا انس، سید علی مرزا کے صاحبزادے تھے، میر انیس کے خاندان کے بعد مرزا انس کا خاندان مرثیہ نگاری میں بہت مشہور ہے، شیخ ناسخ کے شاگرد اور کہنہ مشق شاعر تھے۔ شعر و شاعری کا ملکہ خداداد تھا، ہر یکشنبہ کو ان کے دولت خانہ پر لکھنؤ کے مشہور شعراء جمع ہوتے، اور علمی و ادبی مباحثے ہوتے رہتے، یہ نشستیں بقول پروفیسر احتشام حسین ماہلی اُردو شاعری کی ترقی و اشاعت میں کافی اہمیت رکھتی ہیں اور ان مجالس سے مرزا انس کے ذوق ادب و شعور کا بھی پتہ چلتا ہے، پہلے سو روپیہ ماہوار شاہی خزانہ سے ملتے رہے۔ انقلاب حکومت کے بعد رام پور احترام و عزت کے ساتھ بلائے گئے لیکن ان کا وہاں جی نہ لگا، فدائے لکھنؤ ساکن رام پور، نہ ہو سکا، یہ واپس آگئے اور ۷۵ سال کی عمر میں ۱۳۰۲ھ مطابق ۱۸۸۴ء میں پیوند خاک وطن ہو گئے۔

مرزا انس سے لکھنؤ میں مرثیہ گویوں کا ایک نیا سلسلہ جاری ہوا، ان کے پانچوں صاحبزادے صاحب فضل و کمال اور شاعر تھے، مرثیہ گوئی میں ہر ایک استاد تھا، خود مرزا انس صاحب دیوان تھے، ان کا کلام زیور طباعت سے معلوم نہیں کیوں آراستہ

نہ ہو سکا، پہلے یہ ان کے خاندان میں محفوظ تھا، خدا جانے انقلاب جدید نے اس خزانہ کو محفوظ رکھا یا ضائع کر دیا۔

لطف یہ ہے کہ ناسخ کے شاگرد ہونے کے باوجود، رنگ ناسخ ان کے یہاں نہیں ہے، کلام میں صفائی، سادگی، جوش اور سلاست ہے، درد و اثر بھی کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ مرثیہ نگاری کے چند نمونے ذیل میں دیے جاتے ہیں۔

تمہید

اے نظم سخن نظم ثریا کو خجل کر　　اے گوہر مضموں دُرِ یکتا کو خجل کر
اے نالۂ دل بلبل شیدا کو خجل کر　　اے برق دلا طور تجلّی کو خجل کر
مدّاح کا دل نور کا مسکن نظر آوے
کاغذ کا ورق وادیٔ ایمن نظر آوے

رزمیہ شاعری

اُمڈا سیاہ شام کے بادل کا دل پہ دَل　　شکلیں مہیب، گرد پہ گرد اور ریل پہ ریل
تیغ و سناں کی نوک پہ تھی نوک پھل پہ پھل　　کھایا غضب میں شاہ کی زلفوں نے بل پہ بل
آنکھیں ہوئیں جو سرخ تو گلگوں عذار بھی
ابرو چڑھے، اگلنے لگی ذوالفقار بھی

اخلاقیہ

خالی کبھی چمن ہے گلوں سے بھرا کبھی　　نخلِ مراد خشک کبھی ہے ہرا کبھی
حاصل ہے غم بہت جو خوشی ہے ذرا کبھی　　عشرت کدہ ہے گھر کبھی ماتم سرا کبھی
عبرت کی جا ہے شادیٔ قاسم میں کیا ہوا
نوبت خوشی کی آتے ہی ماتم بپا ہوا

جذبات نگاری

یارب کسی کا باغِ تمنا خزاں نہ ہو — دنیا میں بے چراغ کوئی خانماں نہ ہو
ماں باپ سے جدا پسرِ نوجواں نہ ہو — چھٹ جائیں سب یہ فرقتِ آرامِ جاں نہ ہو
گر لاعلاج ہے تو کلیجے کا داغ ہے
بدتر وہ قبر سے ہے جو گھر بے چراغ ہے

تلوار کی تعریف

وہ تیغ برق سے بھی سوا تھی جو شعلہ بار — جنگل میں آگ لگتی تھی پرتو سے بار بار
بستی پہ آئی اوج سے جو ہو کے بے قرار — شعلے کی طرح کانپ گئے ڈر سے اہلِ نار
جب کوند کر اُٹھی تو شرارے عیاں ہوئے
ثابت ہوا ہلال سے تارے عیاں ہوئے

حسین مرزا عشق

حسین مرزا عشق میر انیس کے بڑے صاحبزادے تھے۔ میر انیس و مرزا دبیر کے ہم عصر تھے، اگرچہ ان کا شمار اُستادوں میں ہوتا تھا لیکن میر انیس اور مرزا دبیر جیسے باکمالوں کے سامنے ان کو شہرت و مقبولیت کم حاصل ہوئی۔ یہ حقیقت ہے کہ ان کا کلام صاف، ستھرا، سلیس اور اعلیٰ درجہ کا ہے، اور اس میں اغلاط کم ہیں، صنائع بدائع کا بھی استعمال اعتدال کے ساتھ کیا ہے۔ زبان و بیان بھی دلکش اور سادہ ہے۔ غرض ان کے پختگی کلام میں شبہہ نہیں۔ تاریخ وفات معلوم نہیں ہو سکی۔

میر مونس

میر محمد نواب مونس میر انیس کے چھوٹے بھائی تھے اور بہت اچھا مرثیہ کہتے تھے،

میر انیس انھیں بہت چاہتے تھے۔ بہت زود گو تھے۔ ان کے کلام میں درد و اثر کافی ہے۔ راجہ امیر حسن خاں والی ریاست محمود آباد ان کے شاگرد تھے۔ مرثیوں کا مجموعہ شائع ہو چکا ہے۔

پانچواں دور

میر انیس اور مرزا دبیر کا دور، مرثیہ کا سنہرا دور تھا، مرثیہ کو جو عروج و کمال اس دور میں نصیب ہوا، وہ نہ اس کے بعد ہوا اور نہ اس سے پہلے ہوا تھا۔ گویا اس دور میں مرثیہ گوئی کا چاند گہن میں آگیا اور اس کے کئی اسباب بھی تھے۔

۱۔ میر انیس اور مرزا دبیر کے بعد، میدان مرثیہ گوئی میں شعراء کو اپنے کمالات دکھانے کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہی تھی۔

۲۔ مرثیہ گوئی کی ترقی و اشاعت کے کئی اسباب تھے، بقول سید عبدالجلیل حسنی سب سے پہلی وجہ مذہبی عقیدت اور محبت اہلبیت کرام تھی، جس نے تمام شعراء کو مرثیہ گوئی کی طرف مائل کیا، اور وہ خیر و برکت اور ثواب کے لئے مرثیے ضرور کہتے تھے، دوسرا سبب شاہان اودھ اور عمائدین سلطنت کی مرثیہ پرستی تھی، جنھیں حضرت امام حسین علیہ السلام اور اہلبیت اطہار سے دلی عقیدت تھی، غم حسین انکی رگ رگ میں سرایت کر چکا تھا۔ وہ ماتم حسین کو ذریعہ نجات سمجھتے تھے، اور مصائب کربلا کو جس قدر مؤثر اور دردناک پیرایہ میں بیان کیا جاتا، اسی قدر ان کی خوشنودی مزاج کا باعث ہوتا تھا، اس لئے مرثیوں کا سننا اور سنانا مذہبی اور دینی فریضہ سمجھتے اور وسعت قلب کے ساتھ مرثیہ نگاروں، سوزخوانوں، نوحہ اور سلام پڑھنے والوں کی سرپرستی کرتے، شعراء نے مرثیہ گوئی کو دینی و دنیوی فلاح کا باعث سمجھ کر،

اس پر بڑی محنت اور کاوش کی لیکن جب انقلاب ہندوستان نے تخت وتاج کے مالکوں کو اسیر قید فرنگ کر دیا، امراء، شرفاء اور اعیان سلطنت خود در بدر کی خاک چھاننے لگے۔ صاحب عزّو جاہ و مال، دانے دانے کے محتاج ہو گئے، تو قدردانِ شعر و سخن کا شیرازہ منتشر ہو گیا ہو گیا، مرثیہ گوئی انیس کے دم سے وابستہ تھی، اس لئے اس پر بھی زوال آگیا اور لکھنؤ میں مرثیہ نگار جسد بے روح کی طرح ہو کے رہ گئے۔ کوئی ان کو پوچھنے والا نہ رہا۔ یہ حقیقت ہے کہ اس پریشان حالی میں جتنے بھی مرثیہ نگار باقی رہے اور انھوں نے مرثیہ گوئی کو بہرحال قائم رکھا، اس سے ان کے فطری رجحان اور تعلق کا پتہ چلتا ہے۔ وہ اپنے خزاں آلود چمن کو خونِ جگر سے سینچتے رہے اور اسے سرسبز و شاداب، تروتازہ بنانے کی مسلسل کوشش کرتے رہے، ان میں سے قابلِ ذکر مرثیہ نگار یہ ہیں۔

میر خورشید علی نفیس، میر جلیس، سید علی محمد عارف، مرزا تعشق، پیارے صاحب رشید اور مرزا محمد جعفر اوج نے مرثیہ کے وقار کو بلند رکھنے میں بڑی نمایاں خدمات انجام دی ہیں۔ ان حضرات نے اپنے بزرگوں کے نقش قدم پر چلنا فخر سمجھا۔ البتہ میر نفیس نے ساقی نامہ کا اضافہ کیا اور پیارے صاحب رشید نے بہاریہ کا اضافہ کیا اور ساقی نامہ اور بہاریہ کو طول دیکر مستقل عنوان بنایا۔

اس دور کے دوسرے شعرا نے بھی حالات و جذبات سے مجبور ہو کر مرثیے لکھے، کسی نے قومی تباہی پر آنسو بہائے، کسی نے شخصی مرثیے لکھے، کسی نے ذاتی۔ یہ مرثیے مسدس کے علاوہ قطعہ، غزل، ترکیب بند اور نظم کی صورت میں لکھے گئے۔ حالی نے غالب کا مرثیہ اور شبلی نے اپنے بھائی اسحاق کا مرثیہ بڑے موثر انداز میں

لکھا۔ دوسرے شاعروں نے بھی مرثیے لکھے۔ غرض یہ دور مرثیہ کے انحطاط کے باوجود مرثیہ گوئی کی تمام خصوصیات رکھتا ہے اور مرثیوں میں آئندہ ہونے والی تبدیلیوں کی نشان دہی کرتا ہے۔

میر نفیس ۔ میر خورشید علی نفیس، میر انیس کے بڑے صاحبزادے تھے، اپنے پدر بزرگوار سے ہی اصلاح سخن لیتے تھے۔ اور اپنے سب بھائیوں میں زیادہ مشہور اور ممتاز تھے۔ نہایت منکسر مزاج، قابل، خوش گو اور پُرگو شاعر تھے، ان کے کلام میں انیس کا رنگ جھلکتا ہے؛ مرثیہ میں انھوں نے ساقی نامہ کا اضافہ کیا۔ مراثی و سلام و رباعیات کا کافی ذخیرہ انھوں نے چھوڑا، ۱۳۱۸ھ مطابق ۱۹۰۰ء میں انتقال کیا۔

مرزا تعشق مرزا تعشق شیخ ناسخ کے شاگرد تھے، میر انیس ان سے بڑی محبت کرتے تھے۔ مرثیہ اور غزل دونوں کے استاد مانے جاتے تھے، ان کا کلام جذبات، حسنِ بندش، نزاکت خیال اور تاثیر کے لئے مشہور ہے۔ ان کی سب سے زیادہ نمایاں خصوصیات اثر آفرینی اور سہل نگاری ہے۔ اس دور کے مرثیہ گو شعرا میں ان کا خاص درجہ ہے اگرچہ غزلیں بھی کہتے تھے لیکن ان کی شہرت کا زیادہ تر دار و مدار مرثیوں ہی پر ہے۔ ناسخ کی مضمون آفرینی، اور انیس کی مرقع نگاری دونوں ان کے کلام میں جمع ہوگئی ہیں۔ انھوں نے واقعات اور روایات کی صحت پر خاص توجہ کی ہے۔ ۱۳۰۹ھ میں بعمر ۰۰ سال انتقال فرمایا۔

پیارے صاحب رشید سید مصطفےٰ نام، عرف پیارے صاحب رشید ۱۸۴۶ء میں پیدا ہوئے، میر اُنس کے پوتے اور احمد مرزا صابر کے صاحبزادے تھے، ان کی والدہ محترمہ جناب انیس کی صاحبزادی تھیں، رشید صاحب کی شادی حقیقی

ماموں زاد بہن یعنی میر عسکری رئیس خلف میر انیس کی صاحبزادی کے ساتھ ہوئی تھی۔ میر انیس ان کو بہت عزیز رکھتے تھے اور ان کی تعلیم و تربیت پر خاص توجہ صرف کرتے تھے۔ انھوں نے شاعری میں اپنے جد امجد کے علاوہ میر عشق اور میر تعشق سے بھی مشورہ کیا۔ اس وجہ سے ان کے کلام میں میر انیس اور میر تعشق کا رنگ نمایاں ہے۔ مرثیوں میں وہ جد امجد سے متاثر ہوئے اور غزلوں میں عم مکرم سے۔ مرثیہ گوئی میں یہ زیادہ مشہور ہوئے اور انھیں مرثیہ نگاری کے باکمالوں کی آخری یادگار سمجھا جاتا تھا۔ انھوں نے مرثیہ میں ساقی نامہ اور بہاریہ کو مستقل طور پر شامل کیا جس سے مرثیہ کی ادبی شان بڑھ گئی۔ سلام بھی لکھے لیکن ان میں غزلوں کا رنگ زیادہ ہے۔ رشید صاحب کی رباعیات کافی مشہور ہیں۔ ان کی زبان دانی مسلم تھی اور لکھنؤ کے ادبا ان سے زبان کے متعلق سند لیتے تھے۔ ان کے شاگرد خاصے مشہور ہیں۔

مرزا اوج | مرزا محمد جعفر اوج خلف مرزا دبیر، اپنے پدر بزرگوار کے صحیح جانشین تھے۔ عروض میں انھیں کافی مہارت تھی اور اس فن کے استاد تسلیم کئے جاتے تھے۔ ان کے کلام میں مرزا دبیر کے کلام کی ساری خصوصیات موجود ہیں۔ انھوں نے انیس کا اتباع کیا۔ بیان میں وہ زور، الفاظ میں وہ شان و شوکت تو پیدا کر سکے لیکن اپنے والد کے رنگ اور اسلوب بیان کو قائم رکھنے کی ہمیشہ کوشش کرتے رہے اور بڑی حد تک کامیاب بھی ہوئے۔ لکھنؤ کے علاوہ دوسرے مقامات پٹنہ، حیدرآباد، رام پور وغیرہ میں ان کی بڑی شہرت تھی۔ فن عروض میں انھوں نے ایک رسالہ بھی لکھا ہے۔

میر جلیس | سید ابو محمد عرف آقو صاحب جلیس، میر سلیس کے صاحبزادے تھے، پیارے صاحب رشید سے اصلاح لیتے تھے۔ عین عالم شباب میں ۱۳۲۵ھ میں رحلت کر گئے۔ ذخیرہ کلام بہت ہے، اور شہرت بھی نہ ہونے کے برابر ہے۔

سید علی محمد عارف | سید علی محمد عارف، سید محمد حیدر کے صاحبزادے اور میر نفیس کے نواسے تھے، ۱۸۵۹ء میں پیدا ہوئے اور اپنے نانا کی زیر نگرانی تعلیم و تربیت پائی۔ مرثیہ گوئی میں بھی انھیں کے شاگرد ہوئے۔ عارف اپنے عہد کے مشہور زباں داں تھے اور مرثیہ گوئی میں بھی امتیازی درجہ رکھتے تھے، بقول پروفیسر ظہیر الدین علوی "ان کے مرثیے نہایت فصیح و بلیغ اور زوردار ہوتے ہیں"۔ حقیقت ہے کہ ان کے کلام میں مرثیت سب سے زیادہ ہے۔ ۱۳۳۴ھ میں انتقال کیا۔

ان محترم بزرگوں کے علاوہ دولھا صاحب عروج، فائق، قدیم وغیرہ نے خاندانی ورثہ "مرثیہ گوئی" کو قائم رکھا اور محبت اہل بیت کرام کی یاد تازہ کرتے رہے۔

قومی و ملکی و شخصی مرثیوں میں مولانا حالی کا مرثیہ غالب، شاہکار ہے اور مولانا شبلی کا مرثیہ 'خانماں بربادی' بھی درد و اثر، سوز و گداز کا بہترین مرقع ہے۔ یہ دونوں مرثیے بہت مشہور ہیں۔ اقبال سہیل کا مرثیہ اور سراج مچھلی شہری کا مسدس بہت مشہور ہے۔ اس دور سے قدیم روایات کے مطابق 'مرثیہ گوئی' کا خاتمہ سا ہو گیا، جدید انداز میں لکھنے کی طرف شعراء زیادہ توجہ کرنے لگے، اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ان میں دلی تأثرات غم کا اظہار بڑی خوبی سے کیا جانے لگا جن کو پڑھ کر دل پرغم اور چشم پرنم ہو جاتی ہے۔ اس دور کو شبلی کے اس شعر پر ختم کیا جاتا ہے۔

کیا لکھوں قصۂ غم، تاب رقم بھی تو نہیں اب مرے خامۂ پرزور میں دم بھی تو نہیں

مرثیہ کا چھٹا دور

دورِ جدید اردو شاعری کے دیگر اصناف سخن کی طرح مرثیہ میں بھی انقلاب آیا۔ اور مرثیہ اس دور میں محض حصول ثواب کی خاطر واقعات کربلا تک ہی محدود نہیں رہا بلکہ جیسا گذشتہ چوتھے پانچویں دور میں عرض کیا جاچکا ہے۔ ذاتی، شخصی اور قومی و ملکی مرثیے لکھے جانے لگے۔ ان میں قدیم اصول کی پابندی نہیں ہوتی تھی، حالی کے بعد یہ مرثیے زیادہ لکھے جانے لگے، واقعات کربلا کا بیان بھی گریہ و ماتم کے لئے نہیں بلکہ ایثار و قربانی، حریت و آزادی، حق و صداقت، عزم و استقلال، کے لئے کیا جانے لگا۔ کہ مردہ دلوں میں جذبۂ ایثار و خودداری اور حق پسندی پیدا ہو، اور وہ مشکلات کا خندہ پیشانی سے مقابلہ کریں، جس طرح حضرت امام حسین علیہ السلام نے حق و صداقت کا مقابلہ کیا اور باطل کے سامنے سر نہیں جھکایا، اسی طرح ملت کے ہر فرد کا فرض ہے کہ وہ اپنے اندر وہی جذبہ حق پرستی پیدا کرے۔ اس لئے اس زمانے میں جو مرثیے واقعات کربلا پر لکھے بھی گئے ان میں زیادہ تر انہیں خیالات عالیہ کا اظہار کیا گیا۔ جوش نے خاص طور پر خودداری، عزت نفس، حریت اور آزادی پر زور دیا ہے دوسری زبانوں کے مرثیوں کے ترجمے بھی ہوئے۔ نظم طباطبائی نے ٹامس گرے کی مشہور نظم (CHURCH YARD) کا ترجمہ گور غریباں کیا جو نہایت موثر اور پُرسوز ہے۔ جس نے مرثیے کو ایک نئی شکل عطا کی۔

قدیم شکل و صورت اور خیالات و اعتقادات کے اعتبار سے بھی مرثیے لکھے گئے

اور اب بھی لکھے جاتے ہیں لیکن ان مرثیہ نگاروں کو وہ شہرت و مقبولیت نہیں حاصل ہوئی جو ان جدید طرز کے مرثیہ لکھنے والوں کو ہوئی۔ ملک کے بدلتے ہوئے حالات میں ریاض، منشی نوبت رائے نظر، جگر بریلوی، محسن، چکبست لکھنوی، نظم طباطبائی، اقبال، صفی، جوش، حفیظ جالندھری، چاند ملا، سالک وغیرہ نے بڑے دردناک مرثیے لکھے۔ ترقی پسند شعراء نے بھی اپنے کلام میں کسی نہ کسی کے غم میں مرثیے لکھے ہیں، تقسیم ہند کے بعد مشہور شعراء نے قوم و ملک کی تباہی کا مرثیہ غزلوں اور نظموں میں لکھا ہے۔ ۱۹۴۷ء کے بعد اُردو کشی پر بے شمار مرثیے لکھے گئے، اپنی مادری زبان کے گلے پر چھری چلتے ہوئے دیکھنے کی تاب کیسے ہوتی، ہر شاعر کا دل تڑپ اُٹھا اور اس نے مختلف پیرایوں میں اُردو زبان پر مرثیے لکھے۔ اگرچہ ان کی شکلیں مختلف ہیں لیکن سب میں اپنی زبان کی تباہی پر گریہ و ماتم بھی کیا گیا ہے۔ ان نظموں میں رزم و بزم، فخر و مباہات، عزم و حوصلہ، خودداری و خود اعتمادی، شکوہ و شکایت سب کچھ ہے۔ جنگ آزادی (۱۸۵۷ء) کے سلسلہ میں بھی کچھ مراثی لکھے گئے تھے لیکن شائع نہ ہو سکے۔ پروفیسر آل احمد سرور، راجکماری سورج کلا سرور، شاہ سراج الحق مچھلی شہری، علی سردار جعفری، جگناتھ آزاد، پنڈت چاند نرائن رینہ، شریمتی چاند رینہ، سراج لکھنوی اور دوسرے شعراء نے اُردو کے متعلق نظمیں لکھیں جو مرثیہ کی ترجمانی کرتی ہیں۔

ریاض خیرآبادی نے اپنے صغیر السن بچے کا مرثیہ غزل کی صورت میں لکھا۔ اس مرثیہ کے چند اشعار یہ ہیں:۔

رکھا ترے دامن میں ہے کیسے گلِ تر کو ۔۔۔ رکھ آنکھ میں اے قبر مرے نورِ نظر کو

جب خاک سے بچتے نہیں پروردۂ دامن　　کیا لے کے کریں لالہ و گل لال و گہر کو
شب گورِ غریباں میں بسر کرتے ہیں اے موت　　ہم نام کو جا رہتے ہیں آتے ہیں سحر کو
گریاں ہیں ریاضؔ آپ غم مرگ میں کس کے
در پیش یہی راہ ہے ہر فرد بشر کو

منشی نوبت رائے نظرؔ نے اپنے لخت جگر کی موت پر نہایت درد انگیز اور مؤثر مرثیہ لکھا۔ یہ مرثیہ مسدس میں لکھا گیا ہے۔

ہوا تمام امیدوں کا خاتمہ تم پر　　کسی سے اب نہ توقع نہ ہے کسی پہ نظر
جہاں میں اپنا ہوا انجام کیا نہیں ہے خبر　　مرے پہ دیکھئے ملتا ہے اب کفن کیونکر
کہاں گئے مری بگڑی سنوارنے والے
پکار لو مجھے لالہ پکارنے والے

اور یہ بند تو دل کے ٹکڑے ٹکڑے کر دینے والا ہے۔

تمھیں تو تھے کہ اس اجڑے مکاں کا تھا یہ چراغ　　بہار پر تھا اسی نونہال سے یہ باغ
نہ ہوگا اب مجھے حاصل کبھی جہاں میں فراغ　　تمام عمر دلِ ناتواں ہے اور یہ داغ
فغان بلبلِ جاں دل کے پار ہوتی ہے
نظرؔ کے باغ سے رخصت بہار ہوتی ہے

ہزار ناز سے اس لخت دل کو پالا تھا　　کبھی نہ دھوپ میں باہر اسے نکالا تھا
اسی سے خانۂ تاریک میں اجالا تھا　　قمر تھا یہ تو نظرؔ اس قمر کا ہالا تھا
مجھے بھی دفن کرو اس کے ساتھ تربت میں
یہ کس طرح سے اکیلا رہے گا غربت میں

چکبست | پنڈت برج نرائن چکبست نے ملک کے جاں نثار رہنماؤں اور آزادی کے علمبرداروں کی وفات پر نہایت دردانگیز مرثیے لکھے' یہ سب مسدس کی شکل میں ہیں' اور جوش و اثر' سوز و گداز میں ڈوبے ہوئے ہیں۔

بال گنگا دھر تلک کی موت پر

اُٹھ گیا دولت ناموس وطن کا وارث　　قوم مرحوم کے اعزاز کہن کا وارث
جاں نثارِ ازلی' شیر دکن کا وارث　　پیشواؤں کے گرجتے ہوئے رن کا وارث
تھی سمائی ہوئی پونا کی بہار آنکھوں میں
آخری دور کا باقی تھا خمار آنکھوں میں

لاش کو تیری سنواریں نہ رقیبان کہن　　ہو جبیں کے لئے صندل کی جگہ خاک وطن
تر ہوا ہے جو شہیدوں کے لہو سے دامن　　دیں اسی کا تجھے پنجاب کے مظلوم کفن
شور ماتم نہ ہو جھنکار ہو زنجیروں کی
چاہئے قوم کے بھیسم کو چتا تیروں کی

گوپال کرشن گوکھلے کی وفات پر

اجل کے دام میں آنا ہے یوں تو عالم کو　　مگر یہ دل نہیں تیار تیرے ماتم کو
پہاڑ کہتے ہیں دنیا میں ایسے ہی غم کو　　مٹا کے تجھ کو اجل نے مٹا دیا ہم کو
جنازہ ہند کا در سے ترے نکلتا ہے
سہاگ قوم کا تیری چتا میں جلتا ہے

اسی طرح گنگا پرشاد ورما' بشن نرائن　　وغیرہ کے مرثیے لکھے۔

علامہ اقبال | ڈاکٹر اقبال نے شخصی مرثیوں کے علاوہ ملت کی تباہی اور زبوں حالی

پر بھی مرثیے لکھے' نالۂ فراق' والدہ مرحومہ کی یاد میں' مرثیہ داغ' اندلس اور جزیرہ سسلی' ان کے مشہور مرثیے ہیں' نالۂ فراق میں پروفیسر آرنلڈ کی موت پر آنسو بہاتے ہیں۔

جا بسا مغرب میں آخر اے مکاں تیرا مکیں — آہ! مشرق کی پسند آئی نہ اس کو سرزمیں

آگیا آج اس صداقت کا مرے دل کو یقیں — ظلمتِ شب سے ضیائے روزِ فرقت کم نہیں

تازہ آغوشِ وداعش داغ حسرت چیدہ است

ہمچو شمع کشتہ در چشمم نگہ خوابیدہ است

مرزا داغ پر علامہ اقبال کا مرثیہ نہایت دردناک ہے۔ اس میں ادبی لطافت' اثر کی گہرائی اور گیرائی موجود ہے۔

نظم طباطبائی نے ٹامس گرے کی نظم کا ترجمہ "گورِ غریباں" اس انداز سے کیا کہ شاعری اور مرثیہ کے تمام محاسن قائم رہے اور نظم میں ایک جدید شکل کا اضافہ کیا یعنی چار مصرعوں کے بند' جس کا پہلا اور تیسرا' دوسرا اور چوتھا مصرعہ ہم ردیف یا ہم قافیہ ہوتا ہے۔ آخر کے تین بند لکھے جاتے ہیں۔ اس سے پہلے گورِ غریباں کا منظر اور متوفی کے اخلاق و عادات پر روشنی ڈالی ہے

غرض کیا کیا کہوں اک روز کا یہ ذکر ہے سنا — کہ اس میداں میں پھرتے صبحدم اسکو نہیں دیکھا

ہوا پھر دوسرا دن اور نظر سے وہ رہا غائب — خیاباں میں اسے پایا نہ دریا میں اسے دیکھا

پھر اسکے تیسرے دن دیکھتا کیا ہوں جنازے کو — لئے آتے ہیں سب پڑھتے ہوئے کلمہ شہادت کا

تمھیں پڑھنا تو آتا ہوگا آؤ پاس سے دیکھو — یہ اس کی قبر ہے اور یہ کتابہ سنگِ تربت کا

اب آغوشِ لحد میں سو رہا ہے چین سے کیسا گیا افسوس لیکن یہ جواں ناکام دنیا سے
دکھایا جاہ و شہرت نے نہ بھولے سے بھی منہ اپنا پھر ایسے نامرادوں کو بھلا کیا کام دنیا سے

صفی لکھنوی | لسان القوم مولانا صفی لکھنوی نے اپنی شاعری سے قوم کی ترجمانی کی اور اس کو خواب غفلت سے جگایا۔ قوم کے مرثیے کے ساتھ ساتھ انھوں نے ذاتی مرثیے بھی لکھے۔ مولانا حالی کا مرثیہ اور ظریف مرحوم کا مرثیہ صفی مرحوم نے خونِ جگر سے لکھا ہے۔ حضرت ظریف کے مرثیے کے چند اشعار لکھے جاتے ہیں۔

جو اُٹھ نہ سکتا تھا بے سہارے وہ شورِ محشر اُٹھا کے اُٹھا
ستم ظریفی تو کوئی دیکھے ہنسانے والا رُلا کے اُٹھا
یہ سور ماتم ہے یا قیامت دکھائی بے طاقتی نے طاقت
جو ہل نہ سکتا تھا وقت آخر وہ سیکڑوں دل ہلا کے اُٹھا
بٹھا کے نقشِ سخن دلوں پر دکھا کے حُسنِ بیاں کے جوہر
ہزار ہا گُل کھلا کے اُبھرا، ہزاروں نغمے سُنا کے اُٹھا
وہ خواب راحت میں فرش گل پر ہم اور افکار خار بستر
ہزاروں فتنے جگا کے سویا، ہزاروں کانٹے بچھا کے اُٹھا
شکستہ بازو ضعیف کیونکر سنبھالے ٹوٹی ہوئی کمر کو
ظریف دنیا سے اُٹھنے والا، صفی کے دل کو بٹھا کے اُٹھا

جوش کے مرثیوں میں شوق آزادی، خیال سرفروشی، ذوقِ مرگ کی تعلیم ہے۔

کربلا کا گرم میداں تمتماتا آفتاب کشمکش، ہلچل، تلاطم، شور، غوغا، اضطراب
غازیوں کا طنطنہ، بانگ رجز کا دبدبہ طبل کی دوں دوں دوں کمانوں کے کڑکنے کی صدا

قلب اعدا پر حسین ابنِ علی کا رعب و داب   قطرۂ بے مایہ شبنم پہ گویا آفتاب

رسم و راہِ حق سے ربط آئینِ باطل سے عناد   عہدِ جانبازی، سرِ مردانگی، عزمِ جہاد

شوق آزادی، خیالِ سرفروشی، ذوقِ مرگ

یہ تھے انصارِ حسین ابنِ علی کے سازو برگ

حفیظ جالندھری نے جدید طرز پر مرثیے لکھے، مولانا محمد علی مرحوم پر مرثیہ "سرپھرا ملاح" بہت مشہور ہے۔ آخری اشعار پیش ہیں۔

وہی سر جو ہواؤں سے نہ طوفانوں سے جھکتا تھا   نہ فرعونوں سے جھکتا تھا، نہ ہامانوں سے جھکتا تھا

نہ جھکتا تھا کبھی میر و وزیر و شاہ کے آگے   وہ سر اک مرتبہ پھر جھک گیا اللہ کے آگے

تعجب سے ردائے ابر میں سے برق نے جھانکا   کہ یہ اک آخری سجدہ تھا اس مردِ مسلماں کا

پنڈت آنند نرائن ملا نے مہاتما گاندھی کے قتل پر جو مرثیہ لکھا ہے وہ بڑا دردناک ہے، یہ مرثیہ مسدس اور بڑی بحر میں ہے۔

مشرق کا دیا گل ہوتا ہے مغرب پہ سیاہی چھاتی ہے

ہر دل سن سا ہوتا ہے ہر سانس کی لو تھراتی ہے

اتر دکھن، پورب پچھم ہر سمت سے اک چیخ آتی ہے

نوعِ انساں شانوں پہ لئے گاندھی کی ارتھی جاتی ہے

آکاش کے تارے بجھتے ہیں، دھرتی سے دھواں سا اٹھتا ہے

دنیا کو یہ لگتا ہے جیسے سر سے کوئی سایہ اٹھتا ہے

تمام مرثیہ میں مہاتما گاندھی کی رہ نمائی، حق پرستی کا ذکر کیا ہے اور خاک کے ماتھے پر ان کا قتل سب سے زیادہ بدنما داغ بنایا۔

دیکھا نہیں جاتا آنکھوں سے یہ منظر عبرت ناک وطن
پھولوں کے لہو کے پیاسے ہیں اپنے ہی خس وخاشاکِ وطن
ہاتھوں سے بجھایا خود اپنے وہ شعلۂ روحِ پاک وطن
داغ اس سے سیہ تر کوئی نہیں دامن پہ ترے اے خاکِ وطن
پیغام اجل لائی اپنے اس سب سے بڑے محسن کے لئے
اے وائے طلوعِ آزادی آزاد ہوئے اس دن کے لئے

تعلیماتِ گاندھی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے۔

ہستی سیاست کو تو نے اپنے قامت سے رفعت دی
ایماں کی تنگ خیالی کو انسان کے غم کی وسعت دی

آخر میں گاندھی جی کی تعلیمات 'زندہ اور قائم رہنے کا یقین دلایا ہے کیونکہ۔

سینہ میں جو دے کانٹوں کو بھی جا اس گل کی لطافت کیا کہئے
جو زہر پئے امرت کرکے اس لب کی حلاوت کیا کہئے
جس سانس سے دنیا جاں اس سانس کی نکہت کیا کہئے
جس موت پہ ہستی ناز کرے اس موت کی عظمت کیا کہئے
یہ موت نہ تھی قدرت نے ترے سر پہ رکھا اک تاجِ حیات
تھی زیست تری معراجِ وفا اور موت تری معراجِ حیات
جاتے جاتے بھی ہم کو اک زیست کا عنواں دے کے گیا
بجھتی ہوئی شمع محفل کو پھر شعلۂ رقصاں دے کے گیا
تو چپ ہے لیکن صدیوں تک گونجے گی صدائے ساز تری
دنیا کو اندھیری راتوں میں ڈھارس دے گی آواز تری

آخر کار :۔

وہ عجز، غرور سلطانی بھی جس کے آگے جھک جاتا تھا

وہ موم کہ جس سے ٹکرا کر لوہے کو پسینہ آتا تھا

تقاضا کرنے والوں کے ایک فرد نے ستیہ و اہنسا کی اس جیتی جاگتی تصویر کو فرقہ پرستی کی نذر کر دیا۔

اس دور میں دوسری تباہیوں کے ساتھ اُردو زبان پر بھی وقت پڑا، اسکو زندہ درگور اور ملک بدر کرنے کی مسلسل کوشش کی جانے لگی، جس مہاتما نے غلامی سے نجات دلائی، چھ سات مہینے کے بعد ہی اُسے بے گناہ قتل کر دیا گیا جس زبان نے آزادی کے نعرے لگائے اور حریت و آزادی کی جدو جہد میں پیش پیش رہی، اس کو بھی بے دردی کے ساتھ ختم کرنے میں دیس بھگت قوتیں صرف ہونے لگیں۔ زبان کے مٹنے اور برباد ہوتے رہنے کا تماشا، فرقہ پرستی اور غداری کے طعنوں کے ساتھ اُردو شاعر اور ادیب دیکھتے اور کلیجہ مسوس کر رہ جاتے، لیکن کب تک۔

چھپائی چوٹ کلفت کی بہت پُر کیا کریں اُس کو

جگر کے چند ٹکڑے آنسوؤں میں مل کے بہ نکلے

مثال کے لئے یہاں پروفیسر آل احمد سرور کی ایک نظم عزم کوہکنی کے چند بند پیش کئے جاتے ہیں۔

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
غرور عزتِ پرویز و عزم کوہکنی

چراغ اہلِ محبت کب آندھیوں سے بجھا
خرد کو راس ہی آئی جنوں کی خندہ زنی

یہ قہر کون سہے گا کہ اپنی محفل میں
ہجوم شوق نہ ہو لطف داستاں نہ رہے

دلوں میں ساغر سرشار کا ترانہ نہ ہو
لبوں پہ غالب و اقبال کی زباں نہ رہے

اُبھرنے دو ابھی موجوں کا سازِ زیرِ لبی — یہ نقشِ عشرتِ ساحل مٹا ہی دیتا ہے
بلا سے ریت میں ہوتا ہے جذب ہونے دو — یہ قطرہ قطرہ لہو، گُل کھلا ہی دیتا ہے

غرض مرثیہ میں جدید طرز و خیالات کی وجہ سے اور بھی وسعت و جامعیت پیدا ہو گئی۔

خطوطِ انیس | عرصہ ہوا لکھنؤ کے مشہور علم دوست رئیس مہا راجہ علی محمد خاں والی محمود آباد نے اپنی ایک نجی صحبت میں انیس اکاڈمی قائم کرنے پر زور دیا بلکہ کافی امداد دینے کا وعدہ بھی فرمایا۔ اسی سلسلہ میں لکھنؤ کے مشہور مقنن سید وزیر حسن صاحب نے جناب انیس کے خطوط اور ان کی اصلاحات شائع کرنے پر زور دیا اور ایسے مفید ادارہ کے قیام کو ضروری سمجھا۔ سید صاحب خود عمدہ مرثیہ گو شاعر تھے اور ہر سال مخصوص مجالس میں اپنا مرثیہ پڑھتے تھے اور لوگ اسکی قدر کرتے تھے۔ مہاراجہ محمود آباد بھی ہر سال ایک مرثیہ مخصوص مجالس میں ضرور پڑھتے تھے۔ اُن تمام محترم حضرات کا خیال تھا کہ وہ تمام مراثی شائع کر دئے جائیں جن پر میر انیس نے اصلاحیں دی ہیں۔ لیکن افسوس ناک امر یہ ہے کہ انیس اکاڈمی قائم نہ ہو سکی۔

کس قدر افسوسناک بات ہے کہ اس شہنشاہ سخن کے نجی اور ادبی خطوط بھی شائع نہ ہو سکے۔ سید مجاور حسین الہ آبادی کا خیال ہے کہ متقدمین نجی خطوط کا شائع کرنا پسند نہ کرتے تھے۔ یہ بڑی سنگین فروگذاشت ہے۔ ہم لوگوں کو باوجود انتہائی کوشش کے انیس کا ایک خط بھی نہ مل سکا۔ بیگم اسمٰعیل کہتی ہیں کہ سید نذیر آغا کی خوشدامن جو انیس کی حقیقی بھتیجی تھیں ان کے پاس انیس کے اکثر خطوط موجود تھے لیکن وہ بھی نہ مل سکے۔ سنا ہے سید مسعود حسن صاحب رضوی کے کتب خانے میں انیس کے کچھ خطوط اور انکی ذاتی ڈائری کے کچھ اوراق موجود ہیں۔ اگر سید صاحب اس ڈائری اور ان خطوط کو شائع کر دیں تو یہ بڑی ادبی خدمت ہو گی۔

حالاتِ انیسؔ

گلشن میں صبا کو جستجو تیری ہے　　بلبل کی زباں پہ گفتگو تیری ہے
ہر رنگ میں جلوہ ہے تری قدرت کا　　جس پھول کو سونگھتا ہوں بو تیری ہے

نام و نسب انیسؔ تخلص۔ ببر علی نام۔ خاندان سیادت سندی تھا اور شاعری گھرانے میں میراث چلی آتی تھی۔ ان کے اجداد میں سے میر امامی موسوی شاہجہاں کے عہد میں ہرات سے دلّی آئے۔ فاضل متبحر اور فقیہ بے مثل تھے۔ شعر و سخن سے بھی ذوق رکھتے تھے۔ جوہر شناس بادشاہ کی شرفا پروری سے سہ ہزاری منصب پایا اور اسی ملک میں آباد ہوگئے۔ بقول صاحب یادگار انیس چار پشتوں تک یہ خاندان دلّی میں معزز و ممتاز رہا۔ جب سلطنت مغلیہ کا آفتاب اقبال لب بام آیا۔ شرفا نوازی کا کال ہوا۔ میر امامی کے پرپوتے غلام حسین ضاحک جو مرزا رفیع سوداؔ کے ہم عصر۔ نہایت خوش صحبت زندہ دل اور فرخندہ جبیں تھے۔ حوادث روزگار سے ترک وطن پر مجبور ہوئے اور اپنے خلف الرشید میر حسنؔ کو ساتھ لیکر جس کی عمر اُس وقت صرف بارہ سال کی تھی نواب وزیر اودھ کے سایۂ عاطفت میں فیض آباد آ پہونچے۔ شجاع الدولہ نواب وزیر کی محل خاص امتہ الزہرا بیگم نے اُس وقت فیض آباد کو دلّی کا ایک محلہ بنا رکھا تھا۔ انکی فیاضی اور سیر چشمی ضرب المثل تھی۔ دلّی کا ادنیٰ اور اعلیٰ جو آتا اُس کے ساتھ برادرانہ سلوک کرتی تھیں۔ آوارہ وطن ساوات کی خاطر مدارات تعظیم و تکریم ہوئی اور یہ خانوادہ فضل و کمال فیض آباد میں آباد ہوگیا۔

شجاع الدولہ کی وفات کے بعد نواب آصف الدولہ مسند نشیں ہوئے۔ انکا

فیض آباد میں دل نہیں لگا۔ اپنی ماں" بہو بیگم" کی روک ٹوک سے گھبرا کے شکار کے بہانے فیض آباد سے لکھنؤ آ گئے۔ اور یہیں محلسرائیں، باغات اور بازار تیار کرا کے رہ پڑے۔

مرکز حکومت لکھنؤ مقرر ہوا تو تعلقات شاہی کی وجہ سے میر ضاحک اور میر حسن کی آمد و رفت لکھنؤ میں جاری ہوئی اور مثنوی سحر البیان کا فخر روزگار مصنف اسی زمین کا پیوند ہوا۔ اُستاد وقت مصحفی نے "شاعر شیریں زبان" مادہ تاریخ وفات نکالا۔

اس ثنا خواں کے بزرگوں میں ہیں کیا مداح جد اعلیٰ سے نہ ہوگا کوئی اعلیٰ مداح
باپ مداح کا مداح ہے دادا مداح عم ذی قدر ثنا خوانوں میں یکتا مداح

جو عنایات الٰہی سے ہوا نیک ہوا
نام بڑھتا گیا جب ایک کے بعد ایک ہوا

میر حسن کے تین بیٹے شاعر تھے جن میں سے میر مستحسن۔ خلیق اور میر محسن۔ محسن امۃ الزہرا بیگم کی سرکار سے تعلق رکھتے تھے۔ اور میر مستحسن، خلیق دارا ب علی خاں کی خدمت میں حاضر باش تھے۔ ان سب کا قیام فیض آباد میں رہتا تھا۔ اگرچہ ضروریات زمانہ کبھی کبھی لکھنؤ جانے پر مجبور کرتی تھیں۔ خلیق اپنے پدر عالی قدر کے ارشاد کے مطابق ۱۹ سال کی عمر میں شیخ مصحفی کے شاگرد ہوئے اور اس "شاعر گر" استاد نے اپنے تذکرے میں خلیق کی شاگردی کا فخر د مباہات سے ذکر کیا ہے۔ انھوں نے کچھ عرصہ تک عاشقانہ غزل گوئی کی مشق کی اور ایک مشاعرہ میں جہاں خواجہ آتش بھی تشریف رکھتے تھے غزل پڑھی جس کا مطلع تھا۔

رشک آئینہ ہے اُس رشک قمر کا پہلو صاف اِدھر سے نظر آتا ہے اُدھر کا پہلو

آتش نے اپنی غزل پھاڑ ڈالی اور کہا کہ جب ایسا شخص فیض آباد میں موجود ہے تو میری کیا ضرورت ہے۔ وہ صاحب دیوان تھے۔ مگر اُسے رواج نہیں دیا۔ مرثیہ گوئی شروع کی اور سرمایہ مضامین جو بزرگوں سے ورثہ پہنچا تھا۔ زادِ آخرت میں صرف کر دیا۔ ان کی نیک نیتی پھل لائی۔ خدا نے تین باکمال فرزند انیس، مونس، اُنس، عطا کیے جن میں سے خلف اکبر آفتاب بن کر چمکے اور سارے گھر میں اُجالا کر دیا۔ ورنہ آج میر حسن کے سوا اس خانوادۂ سیادت میں سے کسی کا نام روشن نہ ہوتا۔

پیدائش اور طفولیت ۱۲۱۶ھ میں نواب سعادت علی خاں اودھ کی حکومت پر رونق افروز تھے، اسی عہد زریں میں "محلہ گلاب باڑی شہر فیض آباد میں انیس کی ولادت ہوئی۔ اُس زمانہ میں میر خلیق عسرت سے زندگی بسر کرتے تھے۔ اُمرا و اعیانِ ریاست لکھنؤ میں تھے۔ فیض آباد اُجڑ رہا تھا۔ وہ ہر سال مرثیوں کا جزدان بغل میں لے کر لکھنؤ جاتے" پیر بخارا میں قیام کرتے۔ تین چار سو روپیہ حاصل کر کے لاتے اور پرورش عیال میں صرف کرتے تھے، صاحبزادہ کے پیدا ہوتے ہی کاشانۂ سیادت روشن ہو گیا۔ صورت کا رعب و ادب دیکھ کر ببر علی نام رکھا اور شکر الٰہی بجا لائے۔ فیض آباد میں ایک ادبی دفتر محاورات، اصطلاحات اور ضرب الامثال اُردو" کی تدوین کا قائم تھا۔ میر حسن مرحوم اُس دفتر کے میر منشی رہے تھے۔ اب یہ خدمت میر خلیق کے سپرد ہوئی۔ جب کوئی جدید محاورہ محلات سے ترش کر نکلتا۔ دفتر میں قلمبند ہوتا جس گھرانے میں الفاظ کی تحقیق و تنقید ہوتی تھی اُسی میں اس مولود مسعود نے آنکھیں کھولیں۔ خورشید کمال اپنے انتہائی عروج کے وقت بھی اس نعمت خداوندی پر فخر کرتا۔ اور جب اُس کی محاورہ بندی یا روزمرے پر کوئی معترض ہوتا تو فرماتے کہ" یہ میرے

ل؎ ناطق لکھنوی تاریخ اُردو ادب۔

گھر کی زبان ہے حضرات لکھنؤ یوں نہیں بولتے۔

تعلیم اور تربیت | والد بزرگوار برسوں سے دفتر سے متعلق تھے اور ماں بھی اتنی فارسی جانتی تھیں کہ جامع عباسی پڑھ لیتیں اور پڑھا دیتی تھیں۔ اُن کی وضع اُن کا لباس اُن کی رفتار گفتار شرافت کا نمونہ سمجھی جاتی تھی۔ بہو بیگم کے توسّل سے جو اُمرائے ریاست ہنوز فیض آباد میں مقیم تھے وہ اس غیور خاندان سیادت کی عزت اپنے لئے باعث آمرزش سمجھتے تھے۔ نکتہ رس بیگمات اور بذلہ سنج خواتین کی گھر میں آمد و رفت تھی اُنھیں کی آغوش ادب میں میر صاحب نے پرورش پائی۔

جب سن شریف چار سال سے متجاوز ہوا شفیق باپ نے مکتب میں بٹھایا اور درسیات کی ابتدائی کتابیں میر نجف علی سے پڑھیں جو اُس وقت فیض آباد میں فاضل مستند تھے۔ عربی کی تکمیل لکھنؤ میں علامہ عصر مولوی حیدر علی سے کی۔ یہ صحیح طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ انھوں نے کس عمر میں تحصیل سے فراغت حاصل کی اور عربی کی تکمیل لکھنؤ آکر اُسی زمانہ میں کی، جب یہ خاندان فیض آباد میں تھا۔ یا درجۂ فضیلت اُس وقت حاصل ہوا جب مستقل طور سے لکھنؤ میں سکونت اختیار کی۔ چونکہ میر خلیق تقریباً ہر سال لکھنؤ آتے تھے اور غازی الدین حیدر کے وقت میں ان کی کافی شہرت دارالسلطنت میں ہو چکی تھی لہذا گمان غالب ہے کہ عالم شباب ہی میں کچھ عرصہ تک لکھنؤ رہ کر میر صاحب نے رائج الوقت علوم کی تکمیل کی ہو۔ حیرت ناک امر ہے کہ بقول صاحب یادگار انیس۔

"اہل لکھنؤ نے میر انیس کو طبقۂ علماء میں کبھی شمار نہیں کیا لیکن ان کا علمی تبحر اور وسعت نظر سب کو تسلیم تھی۔ کہتے ہیں ایک روز کوئی صاحب صدرا کی ایک عبارت پر بحث کر رہے۔ میر صاحب نے اپنے حسن بیان سے اُس مسئلہ کو بغیر کتاب دیکھے اس

خوبی سے حل کر دیا کہ سب دنگ ہو گئے۔ یہ بھی مشہور ہے کہ میر صاحب کو بہ نسبت منقولات کے معقولات سے زیادہ دلچسپی تھی۔ اور اُن کے مختصر کتب خانے میں ہر علم و فن کی ضروری کتابیں جمع رہتی تھیں"۔ میر صاحب کا مشہور مطلع ہے۔

ع جب قطع کی مسافت شب آفتاب نے

ایک صاحب نے غائبانہ اعتراض کیا کہ "مسافت شب ماہتاب طے کرتا ہے نہ کہ آفتاب"۔ بات مشہور ہو گئی اور میر صاحب کے کان تک پہنچی۔ آپ نے برسرِ مجلس علم ہیئت کے استدلال سے فاصلۂ شب میں دورۂ شمسی کو ثابت کیا اور نکتہ چینوں کو ساکت کر دیا۔

اسی طرح ایک مرتبہ گھوڑے کی تعریف میں ارشاد ہوا کہ :۔

سم تر نہ ہوں گر قلزم ذخار پہ دوڑے ۔۔۔ پامال نہ ہوں پھول جو گلزار پہ دوڑے

جس طرح سے بجلی کی صدا تار پہ دوڑے ۔۔۔ اسی طرح رگِ ابرِ گہر بار پہ دوڑے

کسی نے اعتراض کیا کہ بجلی کی آواز تار پر نہیں دوڑتی ہے بلکہ حرکت دوڑتی ہے"۔ آپ نے علم طبعیات سے ثابت کیا کہ مادّی اشیاء میں جب تصادم ہوگا آواز یقینی پیدا ہوگی" اور" وہ فاصلہ جو مادۂ برقی کے خلا میں واقع ہے آواز سے مملو ہے خواہ وہ آواز مسموع ہو یا نہ ہو"۔

فنون سپہ گری اُس وقت تک ہندوستان میں شجاعت و مردانگی کی بُو باقی تھی شریف زادے شہ سواری۔ سیف زنی اور نیزہ بازی کی مشق کیا کرتے تھے۔ انھوں نے بھی امرازادگان فیض آباد کے ساتھ اس ضروری فن کی مشق کی اور پھر لکھنؤ آکر اپنے پڑوسی میر کاظم علی سفید پوش کے بیٹے میر امیر علی سے جو پٹے۔ بانک۔ بنوٹ کے

اُستاد تھے۔" علی محمد" لکڑی کا ٹھاٹھ اور بانک بنوٹ کی گھائیاں سیکھیں۔ اور ایسی صفائی اور چابکدستی حاصل کی کہ کبھی کبھی استاد پر چوٹ کر جاتے تھے۔ یہ تعلیم بھی غالباً اُسی زمانہ میں پائی جب وہ تکمیل عربی کے لئے لکھنؤ میں قیام پذیر تھے اور عنفوان شباب تھا۔ اُن کے اُستاد میر آمیر علی کہا کرتے تھے کہ میر انیس کو اُس عمر اور اُس حالت میں بھی اپنے رکھ رکھاؤ کا اتنا خیال تھا کہ کبھی ننگے بدن مشق فن نہیں کرتے تھے بلکہ اُس کے مناسب کپڑے تیار کرائے تھے اور بالا خانہ کی چھت پر مشق کرتے تھے جہاں میرے اور اُن کے سواد وسرا نہ ہوتا تھا۔ یہ بھی قول تھا کہ " اگر میر انیس کے ہاتھ میں ایک گز لٹھے کے رومال میں مٹھو ساہی پیسہ بندھا ہوتا تو وہ دس لکڑی پھینکنے والوں سے بھی چوٹ نہ کھا سکتے تھے۔ اُن کی ضرب کو بنوٹ جاننے والے کے سوا کوئی روک نہ سکتا تھا" یہ تعلیم آگے چل کر ہمبر سخن کے بہت کام آئی۔ میدان جنگ کی تصویر کشی میں مبارزوں کی فنون حرب۔ ایک دوسرے کے داؤں پیچ۔ نیزہ بازی کی گھاتیں جو آج اُن کی شاعری کا طرّۂ امتیاز ہیں اسی مشق کے سلسلہ میں حاصل ہوئیں۔ اسی زمانہ میں ورزش بھی شروع کی تھی پچاس ساٹھ ڈنڑ فرش پر کرتے اور سو دو سو ہاتھ مگدر کے ہلاتے تھے۔ پیرانہ سالی میں ورزش گھٹ گئی تاہم چند ڈنڑ کرنا اور پچاس ساٹھ ہاتھ مگدر کے ہلانا موقوف نہیں ہوا۔

شکل و صورت بقول سید نذیر[1] آغا میر انیس کا رنگ سانولا اور قد مائل بہ درازی تھا۔ سر کے بال باریک ملائم۔ چہرہ خوبصورت کتابی۔ آنکھیں بڑی بڑی۔ داڑھی باریک کترواتے تھے۔ ایسی کہ لوگوں کو منڈانے کا شبہہ ہوتا۔ گردن صراحی دار۔ سینہ چوڑا۔ چال

---

[1] بیگم اسمٰعیل نے فرمایا ہے کہ نذیر آغا کی خوشدامن میر انیس کی حقیقی بھتیجی تھیں۔

نہایت نستعلیق۔ آخر میں ضعف پیری نے قوی مضمحل کردیے تھے۔ مگر جب منبر پر پہونچتے تو دور سے ایک خوبصورت نوجوان معلوم ہوتے اور خداداد قوت پیدا ہو جاتی تھی۔ سر پر لکھنؤ کی بیضاوی پنج گوشیہ ٹوپی۔ بدن پر گھیر دار لانبا کرتا۔ غرارے دار ڈھیلا پائجامہ۔ پاؤں میں زرد مخمل کی جوتی۔ ہاتھ میں پتلی چھڑی اور سفید رومال۔ نوعمری سے پیری تک اسی وضع پر قائم رہے۔ اور لکھنؤ کی آب و ہوا سے (جو روز جدید فیشن تراشا کرتی تھی) بالکل متاثر نہیں ہوئے۔

شاعری کا آغاز شاعروں کے گھر میں جنم لیا۔ بچپن ہی سے شعر و سخن کی طرف طبیعت مائل تھی۔ ہوش سنبھالتے ہی ابیات عاشقانہ گنگنانے اور ان سے لطف اٹھانے لگے۔ ہزاروں شعر اُردو فارسی کے یاد تھے اور ایک ایک لفظ کی سند میں بیسیوں شعر پڑھ دیا کرتے تھے۔ جمادات، نباتات، حیوانات میں محاسن قدرت کا نظارہ بڑی دلچسپی سے کرتے تھے اور اسی لطف اندوزی نے چند سال کے بعد مناظر قدرت کی تصویر اتارنے میں (بقول صاحب یادگار انیس) مانی و بہزاد پر فائق کر دیا۔ صاحب تذکرہ رند مولوی امیر احمد علوی نے لکھا ہے کہ نواب سید محمد خاں رند جو عمر میں ان سے چار سال بڑے تھے کمسنی سے شعر کہتے اور میر خلیق سے اصلاح لیتے تھے۔ اُن کی عشق انگیز صحبت نے حسن پرستی کی آتش پر ایسا تیل چھڑکا کہ پندرہ سولہ برس کے سن میں دل کا جوش اشعار کی صورت میں ظاہر ہونے لگا۔ سلسلہ تعلیم جاری تھا۔ مشق سخن باپ سے چھپاتے تھے مگر یہ آگ کب دبتی۔ ایک موقع پر کہیں مشاعرہ میں گئے اور غزل پڑھی۔ وہاں بڑی تعریف ہوئی۔ شفیق باپ خبر سن کر باغ باغ ہوا۔ ہونہار فرزند سے پوچھا کل رات کو

کہاں گئے تھے۔ انھوں نے حال بیان کیا۔ غزل سُنی اور فرمایا کہ اب اس غزل کو سلام کرو اور اُس شغل میں زور طبع صرف کرو جو دین و دنیا کا سرمایہ ہے۔ سعادت مند بیٹے نے اس نصیحت پر عمل کیا۔ دنیا کو چھوڑ دین کے دائرہ میں آگیا۔ اور تمام عمر اسی رنگ میں صرف کردی۔ کہا جاتا ہے کہ اس زمانہ میں جو غزلیں تصنیف کی تھیں اُن کا مجموعہ خاندان میں محفوظ ہے لیکن چشم اغیار سے مخفی رکھا جاتا ہے۔ اشعار ذیل اسی عہد کے کلام کا نمونہ ہیں۔

ہوا ہے ابر ہے ساقی ہے مئے ہے — مگر تو ہی نہیں افسوس ہے ہے

لکھ کر زمیں پہ نام ہمارا مٹا دیا — انکا تو کھیل خاک میں ہم کو ملا دیا

تجویز تخلص | جب عربی کی تکمیل کے لئے لکھنؤ میں قیام ہوا مشق سخن جاری تھی سلام کہتے اور والد ماجد سے اصلاح لیتے۔ بیان مصائب کے لئے تخلص "حزیں" مناسب تھا۔ لہذا یہی تخلص اختیار کر رکھا تھا۔ اُس وقت لکھنؤ میں ناسخ و آتش کی محفلیں گرم تھیں۔ یہ دونوں بزرگ میر خلیق کی زباندانی اور سخنوری کا لوہا مانے ہوئے تھے۔ شیخ ناسخ اپنے شاگردوں سے کہا کرتے تھے کہ "بھئی زبان سیکھنی ہے تو میر خلیق کے یہاں جایا کرو"۔ میر خلیق گاہ گاہ شیخ ناسخ سے ملنے جایا کرتے تھے۔ ایک روز اپنے اقبال مند صاحبزادے کو بھی ساتھ لے گئے۔ صحبت شعر و شاعری گرم تھی۔ شیخ صاحب نے میر انیس سے مخاطب ہو کر فرمایا "میاں صاحبزادے کچھ اپنا کلام پڑھو۔ میر صاحب نے والد کی اجازت سے یہ مطلع پڑھا:

کھلا باعث یہ اس بے درد کے آنسو نکلنے کا
دھواں لگتا ہے آنکھوں میں کسی کے دل کے جلنے کا

شیخ صاحب جھومنے لگے۔ میر خلیق سے فرمایا۔ فرزند ہونہار ہے لیکن بجائے حزیں کے تخلص کچھ اور ہو تو بہتر ہے۔ میر خلیق نے کہا۔ آپ ہی کوئی تخلص تجویز فرمائیں۔ شیخ صاحب نے تھوڑی دیر سکوت کر کے فرمایا کہ "مجھ کو تو" انیس" پیارا معلوم ہوتا ہے" حزیں نے بکمال ادب سلام کیا اور اُسی وقت سے انیس ہو گئے۔

اصلاح غلط فہمی | میر مہدی حسن مولف واقعات انیس نے تحریر فرمایا ہے "لکھنؤ کے اکثر کہن سال بزرگوں سے دریافت ہوا کہ زمانۂ امجد علی شاہ میں میر انیس کا مستقل قیام لکھنؤ میں ہوا" اور اس بنا پر بعض محققین کو شبہہ ہوا کہ عہد امجد علی شاہ سے پیشتر میر صاحب لکھنؤ نہیں تشریف لائے اور ان کی شاعری کا آغاز اسی تاجدار کے عہد سے ہے۔ اس خیال کی تکذیب متذکرہ بالا واقعہ سے بخوبی ہوتی ہے۔ شیخ ناسخ نے ۱۲۵۴ھ میں وفات پائی اور امجد علی شاہ ۱۲۵۸ھ میں تخت نشین ہوئے۔ عہد امجد علی شاہ میں ناسخ زندہ ہی نہ تھے تخلص کیونکر تجویز کرتے۔ علاوہ اس کے امجد علی شاہ کے آغاز سلطنت کے وقت میر صاحب کی عمر ۴۲ برس کی تھی۔ اگر اس سن و سال میں وہ پہلی بار لکھنؤ تشریف لائے ہوتے تو میاں امیر علی جنھوں نے میر صاحب کو فنون سپہ گری کی تعلیم دی تھی یہ کیونکر کہتے کہ "نوعمری میں بھی میر انیس کو خودداری کا لحاظ تھا" بیشک عہد امجد علی شاہ کو یہ شرف حاصل ہوا کہ اُس متشرع سلطان کے زمانہ میں اس خاندان کی سیادت نے فیض آباد سے قطع تعلق کر کے مستقلاً سکونت لکھنؤ کی اختیار کی لیکن لکھنؤ کی آمد و رفت عرصہ سے جاری تھی۔ نصیر الدین حیدر کے عہد میں بھی میر انیس مرثیہ کہتے تھے۔ اگرچہ مجلسوں میں پڑھتے نہ تھے اور اس وجہ سے کافی شہرت نہ تھی۔

ابتدائی مرثیے میر انیس کے ابتدائی مرثیے مختصر ہوتے تھے اور اُن کا مقصود محبان حسینؑ کو رُلانا تھا۔ اُس زمانے کے مرثیے بیشتر "اے مومنو" سے شروع ہوتے تھے اور اُن میں رزم کا بیان بہت کم ہوتا تھا۔

سنہ ۱۲۴۹ھ سے سرآمد مرثیہ گویان لکھنؤ۔ میر مظفر حسین ضمیر نے مرثیہ گوئی کا جدید دورہ شروع کیا اور مرزا سلامت علی دبیر نے رزم و سراپا میں وہ بلند پروازی کی کہ قدیم روش نظروں سے گر گئی اور سخن فہم طرز جدید کے مرثیے تلاش کرنے لگے۔ میر خلیق۔ ضمیر اور دبیر کی تقلید اپنے لئے باعث تحقیر سمجھ کر میدان رزم میں مقابل نہیں آئے مگر بلند اقبال فرزند جس کو قسام ازل نے اسی صنف سخن کی تکمیل کے لئے خلق فرمایا تھا یہ عجز کیونکر گوارا کر سکتا تھا۔ اُس نے ابھی تک لکھنؤ میں مجلسیں نہیں پڑھی تھیں لیکن خزانۂ کلام فراہم کر رہا تھا اور وہ وقت قریب تھا کہ سارے شہر کو اپنی خوشنوائی کا اسیر بنائے۔

اُس نے جو عزیمت کی وہ اُسی کی زبان سے سننا چاہیئے۔

مبتدی ہوں مجھے توقیر عطا کر یارب   شوقِ مدّاحیِ شبیرؑ عطا کر یارب
سلک گوہر ہو وہ تقریر عطا کر یارب   نظم میں رونے کی تاثیر عطا کر یارب
جدّ و آبا کے سوا اور کی تقلید نہ ہو
لفظ مغلق نہ ہو گنجلک نہ ہو تعقید نہ ہو

قلمِ فکر سے کھینچوں جو کسی بزم کا رنگ   شمع تصویر پہ گرنے لگیں آ آ کے پتنگ
صاف حیرت زدہ مانی ہو تو بہزاد ہو دنگ   خوں برستا نظر آئے جو دکھاؤں صفِ جنگ
رزم ایسی ہو کہ دل سب کے پھڑک جائیں ابھی
بجلیاں تیغوں کی آنکھوں میں چمک جائیں ابھی

روزمرّہ شرفا کا ہو سلاست ہووے　　لب و لہجہ وہی سارا ہو متانت ہووے
سامعین جلد سمجھ لیں جسے صنعت ہووے　　یعنی موقع ہو جہاں جس کا عبارت ہووے

لفظ بھی چست ہوں مضمون بھی عالی ہووے
مرثیہ درد کی باتوں سے نہ خالی ہووے

بزم کا رنگ جُدا رزم کا میداں ہے جُدا　　مختصر پڑھ کے رُلا دینے کا ساماں ہے جُدا

دبدبہ بھی ہو مصائب بھی ہوں توصیف بھی ہو
دل بھی محظوظ ہوں رقت بھی ہو تعریف بھی ہو

پہلی مجلس | جب لعل و گہر کا خزینہ کافی جمع ہو گیا۔ کئی رباعیاں متعدد سلام اور طرز جدید کے چند مرثیے مرتب ہو گئے۔ شفیق باپ نے ہونہار صاحبزادے سے تحت لفظ پڑھنے کی مشق بھی کرالی تو مناسب خیال کیا کہ ان سے مجلس میں مرثیہ خوانی کرائی جائے تاکہ میر خلیق کا پلّہ جو ضمیر اور دبیر کی بلند پروازی سے کم وزن ہوتا جاتا تھا نقطۂ اعتدال پر آجائے۔ صاحب یادگار انیس منشی امیر احمد علوی کاکوروی نے لکھا ہے کہ "ایک روز اکرام اللہ خاں کے امام باڑہ محلۂ نخاس میں مجلس تھی میر ضمیر بھی تشریف رکھتے تھے۔ مجلس شروع ہونے سے پہلے میر خلیق نے میر ضمیر سے کہا میں چاہتا ہوں۔ آج آپ کے بھتیجے سے ہی کچھ پڑھواؤں۔ میر ضمیر نے فرمایا بسم اللہ۔ میر انیس اپنے والد کے حکم سے منبر پر گئے۔ میر خلیق ممبر کے دوسرے زینے پر بیٹھے تھے۔ یہ اس سے ایک درجہ بلند تیسرے زینے پر بیٹھے اور اس وقار سے بیٹھے کہ تمام حاضرین مجلس کی نگاہوں میں خوب صورت ٹھاٹھ جم گیا۔ پہلے کچھ دیر خاموش بیٹھے رہے پھر ایک رباعی پڑھی۔ چاروں طرف سے واہ واہ سبحان اللہ

کا شور بلند ہو گیا۔

بالیدہ ہوں وہ اوج مجھے آج ملا　　ظلّ علم صاحب معراج ملا
منبر پہ نشست سر پہ حضرت کا علَم　　اب چاہیئے کیا۔ تخت ملا تاج ملا

میر انیس نے پہلے ایک سلام پڑھ کے ساری مجلس کو گرویدہ کر لیا پھر مرثیہ شروع تو رزم بزم کی بولتی چالتی تصویریں اس خوبی اور خوش ادائی سے دکھائیں کہ ہر دل بسمل ہو گیا۔ اعجاز کلام اور انداز بیان نے مجلس کو بیتاب کر دیا۔ سخن شناس جوش شجاعت کے بند سُن کر جھومنے لگے۔

زفرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم　　کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجا ست

جب مرثیہ ختم ہوا سیکڑوں قدر شناس اپنی اپنی جگہ سے اُٹھ کر میر انیس سے مصافحہ کرنے سامنے آئے تعریف کا سلسلہ دیر تک قائم رہا اور اسی مجلس نے ہمیشہ کے لئے انیس کی فصاحت و شیریں کلامی کا سکّہ شہر میں بٹھا دیا۔

لکھنؤ میں مستقل قیام | جب میر انیس کی شہرت روز بروز بڑھنے لگی تو بڑے بڑے نواب و اُمرا اُن کے زیب مجلس ہونے پر فخر کرنے لگے تو امجد علی شاہ کے عہد میں اُنھوں نے فیض آباد سے قطع تعلق کر کے لکھنؤ میں سکونت اختیار کی۔ اُس وقت میر صاحب کی عمر ۴۲ برس سے زیادہ تھی۔ بڑے صاحبزادے میر خورشید علی نفیس اور دو صاحبزادیاں پیدا ہو چکی تھیں۔ لکھنؤ میں میر صاحب کا قدیم مکان محلّہ سبزی منڈی یا شیدیوں کے احاطہ میں تھا۔ یہ محلہ آصف الدولہ کے امام باڑہ کے قریب واقع تھا۔ اور اُس میں شرفا اور اُمرائے شہر کے مکانات تھے۔ سلطنت اودھ کا تختہ اُلٹ جانے کے بعد مکانات کھُدنا شروع ہوئے تو اس محلّہ کا نشان بھی باقی

نہ رہا۔ یہ مکان مختصر تھا اور میر صاحب کی عظمت و شان سے بہت پست مگر تاجداران سخن ملک قناعت کا بادشاہ حرص و ہوس سے متنفر تھا۔ فرماتے ہیں۔

کریم جو تجھے دینا ہو بے طلب دیدے فقیر ہوں پہ نہیں عادتِ سوال مجھے

میر صاحب کے معتقد خاص نواب دیانت الدولہ بہادر نے اسی محلہ میں ایک امام باڑہ اور ایک محلسرا تیار کرائی۔ عاشور خانہ میں پہلی مجلس میر صاحب سے پڑھوائی اور محل نذر کیا۔ غدر کے پُر آشوب ہنگامہ تک یہ خاندان اسی محل میں سکونت گزیں رہا۔

انداز مرثیہ خوانی صاحب یادگار انیس فرماتے ہیں کہ میر صاحب جس طرح مرثیہ گوئی میں کامل تھے ویسے ہی ان کا انداز مرثیہ خوانی بھی بے نظیر تھا۔ کلام پر تبصرہ آئندہ اوراق میں کیا جائے گا مگر اُن کے طرز مرثیہ خوانی کی بابت اسی مقام پر چند سطریں لکھنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

مولانا محمد حسین آزاد آب حیات میں تحریر فرماتے ہیں کہ "میر انیس مرحوم کو میں نے پڑھتے ہوئے دیکھا کہیں اتفاقاً ہی ہاتھ اُٹھ جاتا یا گردن کی ایک جنبش یا آنکھ کی گردش تھی کہ کام کر جاتی ورنہ کلام سارے مطالب کے حق پورے پورے ادا کر دیتا تھا۔"

جناب اشہری حیات انیس میں لکھتے ہیں کہ "میں نے میر انیس کو پڑھتے ہوئے سنا ہے وہ فقط ابرو کے اشارہ اور گردن کی حرکت سے کام لیتے تھے" لیکن مؤلف واقعاتِ انیس ان روایات سے ناراض ہوتے اور فرماتے ہیں کہ "میر انیس کا پڑھنا ہنگامہ آرا تھا وہ جس مقام کو پڑھتے تمام قوتوں سے کام لیتے چنانچہ اُن کا

ایک مصرع سات سال کی عمر میں سنا ہوا میرے حافظہ میں اس وقت تک محفوظ ہے اور اُن کے حرکات کی تصویر اب تک پیش نظر ہے ۔ مصرع

دانتوں میں شجاعانِ عرب داڑھیاں دابے

مرثیہ کو زانو پر رکھ کر دونوں ہاتھوں کو داڑھی کے قریب لاکر اس طرح گردش دی اور ہونٹوں میں فرضی داڑھی کو دبایا یہ معلوم ہوا کہ عرب کے شجاع سپاہیوں کی حالت جنگ میں جوش شجاعت کی تصویر کھینچ دی" ہفت سالہ بچہ کی شہادت معتبر نہیں! خصوصاً جب کہ سن رسیدہ اور ثقہ راوی اُس کی تکذیب کرتے ہوں !!
میر خورشید علی نفیس کے پڑھنے کا وہی انداز تھا جو احسن نے لکھا ہے۔ لیکن محققین کہتے ہیں کہ میر انیس صرف گردش چشم و ابرو سے وہ ہنگامہ برپا کر دیتے تھے جس کے لئے ان کے صاحبزادہ کو تمام اعضائے جسمانی سے کام لینا پڑا۔
شیخ حسن رضا مولف" تردید موازنہ" لکھتے ہیں کہ افراط تفریط کا نام نہیں نشست سے بالائے منبر قدرت خدا کے جلوہ کی تصویر کھینچ دیتے۔ بناوٹ و تصنع کی ہوا تک نہ آنے پاتی تھی۔ تیور اور اشارات مہذبانہ جیسے اُن بزرگ سے ادا ہوئے آج تک کسی غیر سے تو کیا اُن کے خاندان میں کسی سے حتیٰ کہ ان کی اولاد سے بھی وہ شان اور وہ بات دیکھنے میں نہیں آئی" یہ بھی مشہور ہے کہ میر انیس جب کوئی مقام رقت انگیز پڑھتے اور جوش گریہ سے بیچین ہو جاتے تو ضبط کی غرض سے نیچے کے ہونٹ کو دانتوں میں دبا لیتے جس سے داہنی جانب کا رخسارہ متحرک ہوتا تھا۔ اُن کا تو اس انداز سے یہی مقصود تھا کہ جوش گریہ سے آواز گلوگیر نہ ہو مگر قدرتاً یہ دلفریب ادا ہر دل کو بیتاب کر دیتی تھی ۔

صاحب حیات رشید لکھتے ہیں کہ میر انیس کے نواسے جناب پیارے صاحب رشید اکثر فرماتے تھے کہ" انیس کا پڑھنا بہت مہذب تھا۔ وہ صرف آواز کے اتار چڑھاؤ اور اشارات سے کام لیتے۔ آجکل کے پڑھنے والے تو منبر کی چولیں ہلا دیتے ہیں"

کہتے ہیں جب کوئی شخص میر انیس سے انداز مرثیہ خوانی سیکھنے کی درخواست کرتا وہ اس سوال سے منغّص ہو جاتے اور فرماتے تھے کہ" یہ کیا سیکھے گا اور میں کیا سکھاؤں گا۔ بھائی یہ کچھ سیکھنے کا فن ہے وقت پر جو کچھ ہو جاتا ہے ہم خود نہیں سمجھتے کہ ہم نے کیا کیا"

صاحب یادگار انیس لکھتے ہیں کہ شہر کے ایک رئیس زادے میر صاحب کے شاگرد مرثیہ پڑھنے کی مشق کرتے تھے۔ ایک روز میر انیس نے ایک مصرع کو تین بار بتلایا مگر نواب زادہ سے وہ انداز ادا نہ ہو سکا۔ میر صاحب نے مرثیہ ہاتھ سے چھین لیا اور فرمایا۔ ایسے بے مغزوں کو مرثیہ پڑھنا نہیں آسکتا۔ بیکار اپنا وقت خراب کرتے ہیں اور میرا دماغ پریشان ہوتا ہے۔ مصرع یہ تھا۔ ؏

کھینچے جو کماں دے نہ اماں پیل دماں کو

وہ اصول خواندگی کے ساتھ صنعت شاعری کے اظہار کے لئے ان تینوں لفظوں پر زور دیتے جن پر نشان دیا گیا ہے لیکن نواب کو بہ سبب عدم مذاق شاعری مصرعہ کی صنعت کا لحاظ نہیں رہتا تھا۔ میر صاحب اس مصرعہ کو پڑھتے تو کماں، اماں، دماں پر زور دینے کے بعد ایک قلیل وقفہ دیتے تھے اور یہی توقف اس مصرعہ کی جان تھا۔

میر خلیق نے کچھ عرصے کے بعد مرثیہ خوانی چھوڑ دی۔ لیکن قدرتی شاعر کی زبان کیونکر بند ہو سکتی تھی۔ ایک مرتبہ میر انیس یہ روایت نظم کر رہے تھے کہ جناب امام حسینؑ عالم طفولیت میں سواری کے لئے ضد کرتے ہیں آنحضرتؐ تشریف لائے اور فرط شفقت سے خود جھک گئے کہ آؤ سوار ہو جاؤ تاکہ پیارے نواسے کا دل آزردہ نہ ہو۔ اس موقع پر ٹیپ کا دوسرا مصرع کہہ لیا تھا۔ ع

اچھا سوار ہو جئے ہم اونٹ بنتے ہیں

پہلا مصرع برجستہ نہ ہوتا تھا۔ ان کو غور میں دیکھ کر خلیق نے پوچھا۔ کیا سوچ رہے ہو۔ میر صاحب نے مضمون بیان کیا تو بولے کہ یہ مصرع لگا دو۔ جب آپ روٹھتے ہیں تو مشکل سے منتے ہیں۔ سارا بند سنیے تو مصرع کا لطف معلوم ہو۔

پیدل تو عید گاہ میں جانا ہے ننگ و عار — ہم کو بھی آج اونٹ منگا دو تو ہوں سوار

کہنے لگے حسینؑ سے محبوب کردگار — معلوم اب ہوا کہ ہی غصہ تھا میں نثار

جب آپ روٹھتے ہیں تو مشکل سے منتے ہیں

اچھا سوار ہو جئے ہم اونٹ بنتے ہیں

مولانا محمد حسین آزاد کا خیال ہے کہ ذیل کا مطلع و مقطع میر خلیق کے سال کی اخیر کی تصنیف ہے۔

مجرائی طبع کند ہے لطف بیاں گیا — دنداں گئے کہ جوہر تیغ زباں گیا

گذری بہار عمر خلیق اب کہیں گے سب — باغ جہاں سے بلبل ہندوستاں گیا

سعادت مند فرزند نے باپ کا روشن کیا اور ان کی زبان پر ہمیشہ ناز کرتا رہا۔

حق ہے سنا نہیں کبھی اس حسن کا بیاں — گویا کہ یہ خلیق کی ہے سر بسر زباں

اور اُن کے انتقال کے بعد نہایت درد سے کہا۔

ہم مر گئے خلیق کے مرنے سے اے انیس — جینے کا لطف اُٹھ گیا اُس باخدا کے ساتھ

افسوس ہے خلیق سا مشفق پدر نہیں — اِس رنج سے کسی کو کسی کی خبر نہیں

اُسی زمانہ میں ایک نہایت زور کا مرثیہ لکھا تھا، جس کا مطلع ہے۔

آمد ہے کربلا کے نیستاں میں شیر کی

اُس کے مقطع میں فرماتے ہیں:۔

بس اے انیس بس کہ دعا کا ہے یہ مقام — ہو مغفرت خلیق کی یا خالق الانام

مدّاح آل پاک نبیؐ تھا وہ خوش کلام — یارب اسی بزرگ کا یہ فیض ہے تمام

بندہ وہ کون سا ہے کہ جو بے قصور ہے

گر بخش دے تو کیا تری رحمت سے دور ہے

انیسؔ اور دبیرؔ: جب میر خلیق اور میر ضمیر نے مرثیہ خوانی چھوڑی تو انیس و دبیر کے لئے میدان خالی ہو گیا۔ شہر کے خوش مذاق لوگوں نے دونوں کو حریف مقابل بنایا۔ نقادانِ سخن کے جتھے علٰحدہ علٰحدہ بٹے ہوئے تھے۔ انیسی امت اپنے سخن آفرین کی صفائی کلام۔ حُسن بیان اور لطف محاورہ پر جان دیتی۔ اور دبیری اُمت شوکتِ الفاظ، بلند پروازی اور تازگی مضامین پر مٹی ہوئی تھی۔ عالم ہمہ افسانۂ ما دارد و ما ہیچ :: معتقدین باہم لڑتے تھے مگر میر انیس اور مرزا دبیر ایک دوسرے کو نہایت عزت و وقعت کی نظر سے دیکھا کئے۔

سید منظور علی صاحب واقعات کربلا لکھتے ہیں کہ "میر انیس اپنی صحبت میں دبیر کی بدگوئی سننے کے روادار اور نہ مرزا دبیر اپنے حلقۂ احباب میں کسی کو انیسؔ پر

بیجا اعتراض کرنے دیتے۔ کلام پر نکتہ چینی جوہر کمال پر صیقل تھی اور یہ دونوں استادوں کے یہاں ایک دوسرے پر ہوتی رہتی تھی اور کبھی کبھی سخن گسترانہ چوٹیں ہو جاتی تھیں مگر دل صاف تھے اور ایک دوسرے سے کچھ بغض نہیں تھا۔

میر خورشید علی نفیس فرماتے تھے اُن کے والد کے سامنے کوئی شخص صراحتہً یا کنایتہً مرزا دبیر کی تنقیص نہیں کر سکتا تھا اور اسی طرح مرزا دبیر کے یہاں کسی کی مجال نہ تھی کہ میر صاحب پر بیجا حملہ کرے۔ دونوں ایک دوسرے کی نسبت فرماتے تھے کہ ایسا صاحب کمال شاید پھر پیدا نہ ہو۔"

سید آغا حسن آزل لکھنوی نے مرثیوں پر اصلاح دونوں بزرگوں سے لی اور کمال یہ کیا کہ ہر ایک سے اجازت لیکر دوسرے کو مرثیے دکھائے اور ان نیک نفس پاک طینت حضرات نے بخوشی اجازت دی۔

چشمکیں | میر صاحب نے ایک سلام کہا جس کا مطلع تھا۔

سدا ہے فکر ترقی مآل بینوں کو ۔۔۔ ہم آسمان سے لائے ہیں ان زمینوں کو

اور اس میں ایک لاجواب شعر تھا۔

یہ جھریاں نہیں ہاتھوں پہ ضعف پیری نے ۔۔۔ چُنا ہے جامۂ ہستی کی آستینوں کو

قافیہ دشوار تھا اور نہایت بے ساختگی سے نظم ہوا۔ تمام شہر میں دھوم مچ گئی مشاہیر شعراء نے اس زمین میں سلام کہے۔ واجد علی شاہ آخری تاجدار اودھ شاعر تھے۔ انھوں نے بھی یہ قافیہ باندھا۔ فرماتے ہیں :-

جہاد نفس عبادت میں مجھ کو ہے منظور ۔۔۔ وضو کے وقت اُلٹتا ہوں آستینوں کو

مرزا دبیر کے صاحبزادہ مرزا اوج نے بھی اسی زمین میں سلام کہا اور آستینوں

کے قافیہ پر بہت زور دیا۔ کہتے ہیں۔

خدا کے ہاتھ نے اُلٹا جو آستینوں کو
اُلٹ گیا درِ خیبر سے پہلے قلعۂ چرخ

کہ غنچے تھامے ہیں مٹھی میں آستینوں کو
یہ دست بُردِ خزاں کا بہار میں ڈر ہے

حق یہ ہے کہ میر صاحب کے شعر کی ہوا بھی کسی کو نہ پہنچی اور یہ قافیہ انیس کے حصّہ کا ہو گیا۔ ستم یہ ہوا کہ میر انیس کے چھوٹے بھائی میر مونس نے ایک مجلس میں جس میں شاگردان دبیر کا مجمع تھا اپنا سلام اسی زمین میں پڑھا اور اُسمیں یہ طنزیہ شعر بھی تھا۔

اُٹھا چکے ہیں زمیندار جن زمینوں کو
بھلا تردد بیجا سے اُس میں کیا حاصل

اور شاید یہ شعر بھی تھا۔

مقابلہ پہ چڑھاتے ہیں آستینوں کو
نیا مزہ ہے کہ مضموں تو دستیاب نہیں

شہزادگان اودھ میں سے نواب ممتاز الدولہ مرزا دبیر کے شاگرد اس مجلس میں موجود تھے اُن کو سخت ملال ہوا مجلس سے اُٹھ کر چلے گئے۔ پھر تو انیسیوں اور دبیریوں میں شور مچ گیا۔ مرزا صاحب کے مشہور شاگرد میاں مشیر نے خوب بے نقط سنائیں :۔

تو پھونک دوں ابھی خرمن میں خوشہ چینوں کو
جلی کٹی مرے استاد سے کرے کوئی

مشیر کیا کہوں ان احمق الذینوں کو
ہزار بار سزا پا کے منہ پہ چڑھتے ہیں

خجل کیا مری آنکھوں نے دوربینوں کو
لگا کے سرمۂ تربت بہشت دیکھ لیا

اساتذہ کی ہیں غزلیں سلام بھی اکثر
نیا سمجھتے ہیں پھر لوگ ان زمینوں کو

نظیر برادر دبیر نے ایک سلام کے مقطع میں کہا :۔

طعنہ زن ہوتے ہیں جو بیٹھ کے منبر پہ نظیرؔ کیا نہیں جانتے وہ اہل زباں اور بھی ہیں

قربان جائیے ان دونوں بزرگوں کی صفائی قلب کے کہ میر صاحب مونسؔ پر اور مرزا دبیر صاحب مشیرؔ پر بہت خفا ہوئے۔ میر مونسؔ مرزا صاحب کی خدمت میں اور شیخ مشیر میر صاحب کے حضور میں آ کر عذر خواہ ہوئے اور وہ گرد کدورت دور ہو گئی۔

خیال خاطرِ احباب چاہیئے ہر دم انیسؔ ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو

خاص مجلسیں صاحب یادگار انیسؔ نے تفصیل سے لکھا ہے کہ جن مجلسوں میں میر صاحب پڑھتے دور دور سے شائقین آتے تھے، اتنا مجمع ہوتا تھا کہ زانو بدلنا دشوار ہوتا اور دیر سے آنے والوں کو بہ مشکل جگہ ملتی۔ ملکۂ کشور والدۂ واجد علی شاہ کے یہاں مجلسوں میں ہمیشہ میر صاحب پڑھا کرتے تھے۔ حسین علی خاں اثرؔ (خلف مرزا حیدر بیگ نائب نواب آصف الدولہ) کے یہاں اربعین میں روزانہ مجلس ہوتی تھی۔ ایک دن میر صاحب اور دوسرے دن مرزا صاحب پڑھتے لیکن ایک ہی مجلس میں یکے بعد دیگرے کبھی نہیں پڑھتے۔ آٹھویں یا ساتویں محرم کو ایک مجلس میر صاحب نواب علی نقی خاں کے یہاں پڑھتے تھے۔ ایک روز مجلس شروع ہونے سے پہلے نواب صاحب نے پیغام بھیجا کہ میں آج دردِ سر کی وجہ سے حاضری مجلس سے معذور ہوں۔ میر صاحب نے جواب دیا کہ آج میرا بھی مزاج درست نہیں ہے۔ مناسب ہے مجلس موقوف رکھی جائے۔ انشاء اللہ سال آئندہ دیکھا جائے گا۔ نواب صاحب گھبرا کر باہر نکل آئے۔ میر صاحب سے معافی مانگی اور حالت مرض میں اختتام مجلس تک بیٹھے رہے۔

ہر مہینے کی تیئیسویں کو محمد خاں داروغۂ فیل خانہ شاہی کے یہاں محلہ مفتی گنج میں میر صاحب پڑھا کرتے تھے اور اسی محلہ میں اسی تاریخ وزیر خاں داروغہ کے مکان پر

مرزا صاحب پڑھتے تھے۔ صفر کی اٹھارھویں کو حیدر خاں نامی ایک رئیس کے یہاں میر صاحب پڑھتے اور اُسی دن کچھ فاصلہ پر احمد علی خاں سوزخواں کے یہاں مرزا صاحب پڑھا کرتے؛ پچیسویں رجب کو ایک مجلس انتزاع سلطنت کے بعد چوبیٹیوں پر ہوا کرتی اور اُس میں میر صاحب پڑھا کرتے تھے۔ اُسی تاریخ میر باقر تاجر کے امام باڑہ میں مرزا صاحب پڑھا کرتے۔ داروغہ شیخ محمد عباس کے یہاں کنکر کے کنویں پر ۸ر صفر کو میر انیس اور اُسی کے قریب خان بہادر شیخ الطاف حسین کے یہاں مرزا صاحب پڑھتے۔ ہر جگہ اہل کمال کا جمگھٹ اور شائقین کی کثرت ہوتی تھی۔ میر انیس اُسکی تصویر اس طرح کھینچتے ہیں۔

اُمید کسے تھی بزم بھرنے کی ۔۔۔ اللہ جزا دے اس کرم کرنے کی
ماشاء اللہ چشم بد دور انیس ۔۔۔ مجلس میں جگہ نہیں ہے تل دھرنے کی

شاہی مجلس دونوں بزرگ ایک مجلس میں کبھی جمع نہ ہوتے لیکن لکھنؤ کے حضرات دونوں کو جمع کئے بغیر کب ماننے والے تھے۔ نواب مفتاح الدولہ بہادر نے حضرت جانِ عالم واجد علی شاہ کے سامنے دونوں صاحبوں کی تعریف کر کے ایسی تقریر کی کہ بادشاہ سلامت نے دونوں کو ایک مجلس میں جمع کرنے کا ارادہ کر لیا۔ مفتاح الدولہ حسب الحکم دونوں صاحبوں کی خدمت میں حاضر ہوئے اور بادشاہی پیغام پہنچایا۔ حکم سلطانی سے انحراف کیونکر ہو سکتا تھا دونوں نے منظور کیا۔ معینہ وقت پر پہلے مرزا دبیر پہنچے اور باریاب ہو کر ایک جانب بیٹھ گئے۔ میر صاحب کچھ دیر کے بعد پہنچے۔ فرش پر پاؤں رکھتے ہی تمام ارباب مجلس تعظیماً اُٹھ کھڑے ہوئے۔ جب مجلس شروع ہوئی پہلے مرزا دبیر کو پڑھنے کا حکم دیا گیا۔ انھوں نے ایک رباعی بادشاہ کی

تعریف میں پڑھ کر مرثیہ شروع کیا۔ واہ واہ سبحان اللہ کی آوازوں سے شاہی محل گونجنے لگا اور مآل مجلس بھی حاصل ہوا۔ ان کے بعد میر انیس کو پڑھنے کی ہدایت ہوئی۔ میر صاحب کچھ لے کر نہیں گئے تھے۔ اپنے بھائی مونس سے پوچھا کچھ لائے ہو۔ انھوں نے ایک سلام اور مرثیہ پیش کیا اُس کو دیکھا اور فی البدیہہ ایک مطلع تصنیف کر کے منبر پر تشریف لے گئے۔ کچھ دیر تک اپنی عادت کے موافق چپ بیٹھے رہے۔ پھر ایک رباعی جناب امیرؑ کی مدح میں پڑھی۔ چاروں طرف آفریں و مرحبا کا شور بلند ہوا۔ زاں بعد سلام شروع ہوا جس کا فی البدیہہ مطلع یہ تھا۔

غیر کی مدح کروں شہ کا ثنا خواں ہو کر　　مجرئی اپنی ہوا کھوؤں سلیماں ہو کر

اس مطلع کا سننا تھا کہ معنی فہم طبیعتیں ادائے کلام کے مزے لینے لگیں۔ سلام ختم کر کے میر صاحب نے مرثیہ کے چند بند پڑھے جس سے اہل مجلس پر وجد کی کیفیت طاری ہوئی اور رزم بزم کا حق ادا کر کے منبر سے اُترے تمام شہر میں اس مجلس کا شہرہ ہو گیا اور میر صاحب کی خودداری کی دھوم مچ گئی۔ بادشاہ سلامت بھی بہت محظوظ ہوئے اور فتح الدولہ برق سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ "کیوں فتح الدولہ میں نہ کہتا تھا کہ میر انیس لکھنؤ میں ایک ہی شاعر ہیں۔ دیکھا تم نے یہ زبان انھیں کے لئے خاص ہے"۔

شاعری کا تاج میر انیس زوجۂ میر ضمیر مرحوم کی تقریب میں مرثیہ پڑھ رہے تھے۔ رؤسا اور اکابر شہر کے علاوہ شعرائے باکمال کا بھی مجمع تھا۔ خواجہ حیدر علی آتش بھی موجود تھے۔ میر صاحب وہ مرثیہ پڑھ رہے تھے جس کا مطلع ہے۔

آمد ہے کربلا کے نیستاں میں شیر کی　　ڈیوڑھی سے چل چکی ہے سواری دلیر کی

تلوار کی تعریف میں جب اس شعر کی نوبت آئی۔

اشراف کا بناؤ رئیسوں کی جان ہے　　شاہوں کی آبرو ہے سپاہی کی جان ہے

خواجہ آتش کی جانب مخاطب ہو کر فرمایا کہ " اس بیت کی داد آپ سے چاہتا ہوں "
خواجہ آتش کی آزادی اور شوریدہ مزاجی مشہور ہے۔ پہلے سے جھوم رہے تھے۔
یہ بیت سُن کر نصف قد کھڑے ہو گئے اور باآواز بلند کہا " کون بیوقوف کہتا ہے کہ
تم محض مرثیہ گو ہو۔ واللہ ثم باللہ تم شاعرگر ہو اور شاعری کا مقدس تاج تمھارے
سر کے لئے موزوں ہے۔ اللہ مبارک کرے۔

معراج کمال | جان عالم واجد علی شاہ کے آخری زمانہ میں میر صاحب کی شہرت
معراج کمال تک پہنچ چکی تھی اُن کی زبان سے نکلا ہوا ہر ایک لفظ قدر شناس موتیوں
اور جواہرات کی طرح عزیز رکھتے تھے اور ان کا کلام تحفہ کے طور پر دوسرے شہروں میں
بھیجا جاتا تھا۔ ایک دن وہ تھا کہ جب میر صاحب نے فرمایا تھا۔

گر قدرداں ہیں کم تو نہ کر اتنا اضطراب　　جلدی مدد کریں گے شہِ آسماں جناب

اور اب فرماتے ہیں۔

آباد لکھنؤ رہے تا حشر یا الٰہ　　رکھ میرے دوستوں کو جہاں میں بعز و جاہ
یارب ہرا بھرا چمنِ آرزو رہے　　جبتک چمن میں گل رہے اور گل میں بو رہے

جنگ آزادی | یکایک زمانہ کی ہوا پلٹی۔ وزراء عمال کی نمک حرامی سے واجد علی
شاہ معزول ہوئے۔ کمپنی کا راج ہوا۔ زمین و آسمان بدل گیا اور اُس کے بعد ہی غدر
کا مہیب فتنہ و فساد برپا ہوا۔ جس نے کمینوں کو امیر اور شریفوں کو رذیل بنا دیا۔

روستا زادگان دانشمند　　بوزیری پادشہ رفتند
پسران وزیر ناقص عقل　　بگدائی بہ روستا رفتند۔

تمام علمی ترقیاں دفعتہً رُک گئیں ۔ اس سال لکھنؤ کا محرم حسرت و عبرت کی دردناک تصویر تھا ۔[1]

ہائے دل آ آ کے رُک گئے ہائے غضب آنسو نایاب ہو گئے ہائے غضب
جی بھر کے حسینؑ کو نہ روئے اس سال آنکھوں کے نصیب سو گئے ہائے غضب

مشرقی طرزِ حکومت کا فدائی دیکھئے کس درد سے کہتا ہے ۔

کیونکر دلِ غمزدہ نہ فریاد کرے جب ملک کو یوں غنیم برباد کرے
مانگو یہ دعا کہ پھر خداوند کریم اُجڑی ہوئی مملکت کو آباد کرے

باغیوں کی عملداری میں میر صاحب گھبرا رہے ہیں ۔

افسوس زمانہ کا عجب طور ہوا کیوں چرخ کہن نیا یہ کیا دور ہوا
گردش کب تک نکل چلو جلد انیسؔ اب یاں کی زمیں اور فلک اور ہوا

مرزا دبیرؔ نے یہ رباعی سن کر تسکین دی ۔

کس عہد میں تبدیل نہیں دور ہوا گہ عدل کبھی ظلم کبھی جور ہوا
اللہ وہی ہے تو نہ مضطر ہو دبیرؔ کیا غم جو زمین اور فلک اور ہوا

لیکن جب بھگدڑ پڑی اور شرفا روپوش ہونے لگے یہ دونوں بزرگ لکھنؤ سے فرار ہوئے ۔ مرزا دبیر کچھ دنوں کے لئے سیتاپور گئے[2] اور میر انیسؔ نے بھی

---

[1] ۱۸۵۸ء میں محرم اگست کے مہینے میں پڑا اور بھری برسات تھی ۔

[2] خانہ بربادی کے عالم میں مرزا دبیر نے ایک نہایت دردناک رباعی کہی جو عبرتِ ناظرین کے لئے درج کی جاتی ہے ۔

شطرنج دورنگی سے ہیں ششدر بندے آوارہ ہیں شہر شہر در در بندے
اے بندہ نواز ہے تعجب کا محل تو مالکِ ملک اور بے گھر بندے

وطن چھوڑا۔ سنا ہے اس عرصہ میں کچھ زمانہ تک وہ کاکوری میں مقیم رہے۔ جب بغاوت فرو ہوئی امن کا اشتہار جاری ہوا۔ لکھنؤ پھر بسا تو میر صاحب واپس تشریف لائے مگر اختر نگر[1] اُجڑ چکا تھا اور اگلی صحبتیں خواب و خیال ہو گئی تھیں۔

میر صاحب کے شیشۂ دل پر سخت چوٹ لگی فرماتے ہیں۔

یہ کس طرح کا زمانے میں انقلاب آیا ورق اُلٹ گیا دنیا کا یک بیک یوں حرخ

کبھی سُنا ہے کہ پیری گئی شباب آیا پیام مرگ ہے موئے سفید اے غافل

انیسؔ ملک سخن میں بھی انقلاب آیا اُلٹ گیا نہ فقط لکھنؤ کا اک طبقہ

میر انیسؔ کا مکان انتزاع سلطنت کے بعد جب نئی حکومت قائم ہوئی اور رستھٹی محلہ اور رشیدیوں کا احاطہ کھد گیا تو مجبوراً میر صاحب نے چند روز محلہ منصور نگر میں قیام کیا وہاں سے راجہ کی بازار تشریف لے گئے پھر سبزی منڈی میں ایک مکان خود تعمیر کرایا اور اسی میں رہنے لگے۔ مکان کے قریب ایک مختصر باغ تھا جو اب ویران ہو گیا اور اُس جگہ ایک کمرہ بنا ہے جس میں میر صاحب آرام فرماتے ہیں اور اُن کے بعض اعزہ بھی بغل ہی میں آسودہ خواب ہیں۔ حکومت ہند نے اس قدیم مکان کو محکمہ آثار قدیمہ کے تحت لے لیا ہے اور اُمید ہے کہ اب شہنشاہ سخن کے شایان شان اس مکان کی نگہداشت ہو سکے گی[2]

عظیم آباد کا سفر

باہری مجلس جب تک لکھنؤ مرحوم گلزار تھا۔ بلبل بوستاں امیر کو نقل و حرکت کی ضرورت نہ تھی۔ حیدرآباد سے کئی مرتبہ پیام طلب آئے۔ بہار والوں نے

---

[1] اودھ کے آخری تاجدار واجد علی شاہ کا تخلص اختر تھا۔ اس رعایت سے لکھنؤ کو اختر نگر کہتے ہیں۔

اے مصحفی میں رووُں کیا اگلی صحبتوں کو بن بن کے کھیل ایسے لاکھوں بگڑ گئے ہیں

[2] تاریخ اودھ۔ ناظر کاکوروی۔ دفتر ہماری آواز فتح گنج لکھنؤ۔ [یادگار انیس صفحہ ۱۱۰ مطبوعہ انوار المطابع لکھنؤ]

بھی بلایا۔ میر صاحب انکار کرتے رہے۔ جب لکھنؤ مٹ گیا اور داد و دہش کا قحط پڑا۔ میر صاحب نے ۱۸۵۹ء میں پہلی بار پٹنہ کا سفر کیا اور ۱۸۶۰ء میں دوسری مرتبہ نواب قاسم علی خاں کی طلب سے عظیم آباد گئے۔ پردیسیوں نے گھر والوں سے زیادہ خاطر مدارات کی اور ہر سال اس طرف کا سفر معمول ہو گیا۔ ایک سال کسی سبب سے نہ جا سکے تو سال آئندہ کے لئے خاص اہتمام کیا گیا۔ چاروں طرف سے بڑے بڑے رئیس و امیر ارباب علم و کمال میر صاحب کو دیکھنے اور کلام سننے کے لئے وہاں پہنچ گئے۔ ہزاروں آدمیوں کا مجمع تھا سوز خوانی کے بعد ڈھائی گھنٹے تک میر مونس منبر پر تحت لفظ پڑھے اور اپنے کمالات ختم کر دئے۔ جب میر مونس منبر سے اترے میر صاحب کی باری آئی تھوڑی دیر حسب معمول چپ بیٹھے رہے پھر ارشاد فرمایا "صاحبو مجلس کو بہت طول ہو گیا اور غالباً آپ حضرات میر مونس کو سن کر سیر ہو گئے ہوں گے۔ اب فریضۂ ظہر کا وقت آ گیا جس کو جناب سید الشہداء نے تلوار کی دھاروں میں ادا فرمایا ہے میں نماز پڑھ لینا چاہتا ہوں آپ بھی نماز سے فارغ ہو لیں پھر جن صاحبوں کو انیس کا سننا منظور ہو وہ تشریف لائیں اور جو میر مونس کو سن کر سیر ہو چکے وہ اپنے گھروں میں آرام فرمائیں"۔ اس تقریر نے ایک عام مایوسی پیدا کر دی۔ میر صاحب نماز پڑھنے چلے گئے تمام اہل مجلس اٹھ کھڑے ہوئے۔ وہ عالی شان مجمع برخاست ہو گیا کہ ان حضرات نے پھر معاودت فرمائی اور اپنے ساتھ دوسروں کو بھی لائے۔ جو اس سے پہلے شریک نہ تھے۔ جب میر صاحب کو خبر ہوئی کہ مجلس تیار ہے خراماں خراماں تشریف لائے اور منبر پر جا کر فرمایا حضرات مجھ کو اس کا اندازہ کرنا منظور تھا کہ انیس کے

دیکھنے والے کتنے ہیں۔ الحمدللہ آپ صاحبوں نے قدردانی کا ثبوت دیا۔ یہ کہہ کر ساری مجلس کو گرویدہ کرلیا اور دو چار رباعیاں پڑھ کر یہ مرثیہ شروع کیا۔

جب قطع کی مسافتِ شب آفتاب نے — جلوہ کیا سحر کے رُخِ بے حجاب نے
دیکھا سوئے فلک شہِ گردوں رکاب نے — مُڑ کر صدا رفیقوں کو دی اُس جناب نے

آخر ہے رات حمد و ثنائے خدا کرو
اٹھو فریضۂ سحری کو ادا کرو

اس مرثیہ کے مسجع بندوں نے سخن شناس طبائع پر جو اثر کیا بیان نہیں ہو سکتا۔ رزمیہ بندوں کے ہر شعر پر داد واہ سبحان اللہ کی آوازوں سے تمام مکان گونج رہا تھا اور رنج والم کے جانکاہ بندوں پر دلوں میں بجلیاں تڑپتی تھیں۔ میر صاحب نے کئی مرتبہ چاہا کہ مرثیہ ختم کریں لیکن ساری مجلس کے اصرار نے جب تک پورا مرثیہ نہ سُن لیا اُن کا منبر سے اترنا قبول نہ کیا بلکہ اکثر جوہر شناس قطع کا بند سُن کر غمزدہ ہوئے کہ ابھی کیوں مرثیہ ختم ہو گیا۔

حیدرآباد کا سفر ۱۸۷۱ء میں نواب تہور جنگ بہادر نے میر صاحب کو حیدرآباد طلب کیا۔ یہ طلبی دراصل سر سالار جنگ بہادر مدار المہام سلطنت عالیہ کی طرف سے تھی، میر صاحب جانا نہیں چاہتے تھے مگر چند معززین کی سفارش سے مجبور ہو کر حیدرآباد تشریف لے گئے اُس وقت تک براہ راست ریلوے لائن جاری نہیں تھی۔ کچھ دور تک گھوڑا گاڑی پر سفر کر کے براہ گلبرگہ حیدرآباد پہنچے اور سفر کی زحمت سے بیمار ہو گئے مجلس میں حیدرآباد کے تمام امراء و شرفا شریک تھے۔ ہزاروں آدمی مکانوں کی چھتوں پر چڑھ گئے تھے اور ایک جم غفیر جسکو اندر

جانے کی گنجائش نہیں ملی باہر کھڑا ہوا تھا۔ میر انیسؔ تپ میں مبتلا تھے انھوں نے مجلس پڑھنے سے انکار کر دیا۔ فقرہ بازوں نے خبر اڑا دی کہ میر انیسؔ کی علالت مزاج صرف بہانہ ہے۔ وہ حیدرآباد آئے ہی نہیں۔ نواب تہوّر جنگ نے عرض کی کہ حضور منبر پر تشریف لے جائیں اور صرف ایک رباعی پڑھ کر اُتر آئیں کیونکہ دشمنوں نے میری رسوائی کے لئے آپ کے نہ تشریف لانے کی خبر سارے شہر میں اُڑا دی ہے۔ میر صاحب نے فرمایا مجھ میں بالکل قوت نہیں ہے اور نہ میرے ہوش و حواس درست ہیں۔ تجویز ہوئی کہ کسی حکیم حاذق سے میر صاحب کا معالجہ رجوع کیا جائے تاکہ تپ کم ہو کچھ بھی طاقت پیدا ہو جائے تو پھر لوگ خوشامد کر کے اپنا مطلب پورا کر لیں۔ یہ صلاح پسند ہوئی اور کئی حکیموں کے نام پر استخارہ دیکھا گیا۔ ایک ڈاکٹر کے نام پر استخارہ واجب آیا۔ میر صاحب ڈاکٹر کا نام سُن کر متعجب ہوئے اور کہا کہ میں نے کبھی ڈاکٹر کا علاج نہیں کیا ہے۔ ڈاکٹر اپنے معمولات میں شراب کو ہر ایک مرکب کا جزو اعظم سمجھتے ہیں میں ان کی دوا استعمال نہیں کروں گا۔ کہا گیا کہ ڈاکٹر صاحب مسلمان ہیں کوئی دوا خلاف شریعت نہ دیں گے۔ میر صاحب کا شک دور ہوا ڈاکٹر نے تپ اتارنے کی دوا دی۔ میر صاحب کو تھوڑی دیر تک پسینہ آتا رہا اور پھر بخار یک لخت اتر گیا اگرچہ کسل تھا مگر ارکان سلطنت کی خوشامد سے مجبور ہو کر مجلس میں تشریف لائے۔ ذیل کی دو رباعیاں فی البدیہہ تصنیف فرما کر پڑھیں اور منبر سے اُتر آئے۔

رُباعی

اللہ و رسولِ حق کی امداد رہے　　　سرسبز یہ شہر فیض بنیاد رہے
نواب ایسا رئیس اعظم ایسے　　　یارب آباد حیدرآباد رہے

رُباعی

موجود ہے جو کچھ جسے منظور رہے یاں علم و عمل و عطا کا دستور ہے یاں
مختار الملک اور بندگانِ عالی رحمت رحمت پہ نور پر نور ہے یاں

جب طبیعت کسی قدر درست ہوئی میر صاحب نے مرثیہ پڑھا لیکن اختصار کا قصد کیا۔ سامعین نے تقاضا کیا حضور خدا کے لئے ہم سب جانیں لڑائے ہوئے ہیں۔ میر صاحب نے فرمایا کیا خوب آپ کی جانیں لڑی ہیں تو میں کیا کروں میری تو جان پر بنی ہے۔

ایک اور مجلس میں میر صاحب مرثیہ کے بارہ بندوں تک پہونچے تھے۔ دفعتہً خیال گذرا کہ سامعین کو پوری توجہ نہیں ہے۔ بیدل ہو کر حاضرین پر ایک نظر ڈالی مرثیہ توڑ کر زانو پر رکھ لیا اور ایک حسرتناک آواز سے فرمایا "ہائے لکھنؤ تجھے کہاں سے لاؤں"۔ پھر ناسازی طبیعت کا بہانہ کر کے منبر سے اُتر آئے۔

تمام ارباب مجلس مہینوں اس مرثیہ خوانی کا ذکر کرتے اور اُن کے طرز بیان کو یاد کر کے مزے لیتے رہے۔ رخصت کے وقت سر سالار جنگ نے سات ہزار اور نواب تہور جنگ نے تین ہزار روپیہ پیش کئے اور آمد و رفت کا خرچ علیحدہ دیا۔

ان مجالس کی شہرت ہونے کے بعد سر آسمان جاہ بہادر نے چاہا کہ میر انیس اُنکے یہاں مجلس پڑھیں اور اپنی ٹوپی کی جگہ حیدر آباد کی پگڑی رکھ کر زیب مجلس ہوں تو پانچ ہزار روپیہ نذر کیا جائے گا لیکن میر صاحب نے اپنی ٹوپی اُتار کر حیدر آباد کی پگڑی رکھنا قبول نہ کیا

حیدر آباد میں ایک سلام صاحب یادگار انیس نے لکھا ہے کہ ایک مرتبہ حیدر آباد کے

ایک رئیس اعظم مجلس میں تشریف لائے لوگوں نے ہاتھوں ہاتھ منبر کے قریب پہنچایا ہمعصروں نے سروقد تعظیم دی میر صاحب نے فقط اتنا ہی کہا کہ بسم اللہ۔ میر صاحب کا تعظیم کے لئے کھڑا نہ ہونا رئیس مذکور کے خلاف مزاج ہوا انھوں نے اپنے مصاحبوں سے خفیہ طور پر کہا کہ ان کی مرثیہ خوانی کی تعریف نہ کی جائے۔ میر صاحب اس سرگوشی کو تاڑ گئے جب منبر پر تشریف لے گئے تو چند رباعیوں کے بعد یہ سلام شروع کیا۔

ابتدا سے ہم ضعیف و ناتواں پیدا ہوئے — اڑ گیا جب رنگ رخ سے استخواں پیدا ہوئے

پہلے ہی شعر پر رئیس مذکور کو جنبش ہوئی۔ دوسرا شعر شروع کرنے سے پہلے میر صاحب نے رئیس سے مخاطب ہو کر فرمایا "سنئے یہ آپ کے سننے کا شعر ہے"

نوبتِ جمشید و دارا و سکندر اب کہاں — خاک تک چھانی نہ قبروں کے نشاں پیدا ہوئے

نواب بے اختیار تعریف کرنے لگے۔ پھر تیسرا شعر پڑھا۔

خاکساری نے دکھائیں رفعتوں پر رفعتیں — اس زمیں سے واہ کیا کیا آسماں پیدا ہوئے

بس اب پورا رنگ جم چکا تھا۔ چوتھے شعر نے ساری مجلس کو بیتاب کر دیا۔

بود نابود علی اصغر کا کیا کیجئے بیاں — بے زباں دنیا سے اُٹھے بے زباں پیدا ہوئے

اہل دکن کی قدر دانی | میر صاحب پہلے تو اہل دکن کو نافہم و نادان سمجھتے تھے اور کہتے تھے کہ جن محاسن پر انھیں ناز ہے۔ جس شاعری پر وہ فخر و مباہات کرتے ہیں اُس کے لئے زباندانی درکار ہے۔

یک بیک ایسا زمانہ میں ہوا ہے انقلاب — قدرداں سب اُٹھ گئے ناقدرداں پیدا ہوئے

آخر میں میر صاحب کو ان کی سخن فہمی کا اعتراف ہوا۔ رؤسائے شہر نے ایسی

ایسی قدر شناسی کی کہ ایک مرتبہ بعد ختم مجلس نواب تہور جنگ بہادر میر صاحب کو فینس میں سوار کرنے کے لئے دروازے تک تشریف لائے اور میر انیس کی نعلین اپنے ہاتھ سے اُٹھا کر فینس میں رکھیں۔

الہ آباد کی مجلس | نواب سید حسن عسکری فرماتے ہیں کہ جب میر انیس الہ آباد تشریف لے گئے اُن کی آمد کی عام اطلاع کے لئے اشتہار شائع کرائے گئے۔ کالج اور مدارس میں ایک روز کی تعطیل ہوئی۔ تمام کچہریوں میں اہل عملہ کو شرکت کی اجازت دی گئی اور جناب شمس العلماء مولوی ذکاءاللہ سابق پروفیسر عربی الہ آباد کالج بیان کرتے ہیں کہ جب میں اس مجلس میں پہنچا عالیشان مکان شائقین سے بھر چکا تھا۔ سیکڑوں مشتاق دھوپ میں کھڑے ہوئے محو سماعت تھے۔ مرثیہ شروع ہو چکا تھا اور میرا مجلس کے اندر جگہ پانا ناممکن تھا اسلئے میں بھی دھوپ میں کھڑا ہو کر سُننے لگا۔ بقول سید زوار عباس امیر الصدر الہ آبادی اُسوقت میر انیس بوڑھے ہو چکے تھے مگر انکا طرز بیان جوانوں کو مات کر رہا تھا اور معلوم ہوتا تھا کہ منبر پر ایک کل کی بڑھیا بیٹھی ہوئی جادو کر رہی ہے۔ خلق خدا کا دل جس طرف چاہتی ہے پھیر دیتی ہے۔ کبھی ہنساتی ہے کبھی رُلاتی ہے۔ میں اسی حالت میں دو گھنٹے کے قریب کھڑا رہا میرے کپڑے پسینے سے تر اور پاؤں شل ہو گئے لیکن دلچسپی اور محویت کا یہ عالم تھا کہ جب تک میر انیس کی صورت دیکھتا رہا کوئی تکلیف محسوس نہیں ہوئی۔ اب بھی الہ آباد میں خوش ذوق حضرات اس مجلس کو یاد رکھتے ہیں۔

بنارس کی مجلس | ایک مرتبہ میر صاحب پٹنہ سے واپسی کے وقت بنارس میں مجلس پڑھنے کے لئے مقیم ہوئے۔ یہ مجلس قاضی میر یار علی کے امام باڑہ واقع

تیلیا نالے میں منعقد ہوئی تھی۔ اُس وقت میر انیسؔ، میر انسؔ، پھر مونسؔ، میر نفیسؔ، میر وحید پانچوں حضرات رونق محفل تھے۔ پہلے میر وحید نے پیش خوانی کی پھر نفیسؔ پڑھے اُن کے بعد میر مونسؔ اور میر اُنسؔ یکے بعد دیگرے منبر پر تشریف لے گئے۔ میر اُنسؔ برابر کے بھائی تھے انھوں نے کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی۔ مرثیہ نے خوب رنگ دیا اور گریہ بے حد ہوا۔ جب میر انیسؔ سے صاحب خانہ نے درخواست کی میر صاحب نے فرمایا کہ مآل مجلس ہو چکا۔ میر اُنسؔ ماشاءاللہ خوب پڑھے اب میری کوئی ضرورت نہیں مگر صاحب خانہ نے دست بستہ عرض کی کہ یہاں سب حضور ہی کے مشتاق ہیں اُن کو اس سعادت سے محروم نہ رکھئے۔ آخر میر صاحب مجبور ہوئے اور فرمایا کہ حاضرین مجلس کسلمند اور خستہ ہیں تھوڑی دیر آرام کر لیں پھر میں پڑھوں گا۔ حقہ کا دور شروع ہوا نصف گھنٹے کا وقفہ دے کر میر صاحب منبر پر تشریف لے گئے اور مرثیہ ایسا پڑھا کہ اہل مجلس گذشتہ واقعات کو بھول گئے۔ بقول صاحب یادگار انیسؔ " خاکسار جامع اوراق ۱۹۱۵ء میں بسلسلۂ ملازمت بنارس میں تھا اس وقت تک یہ مجلس وہاں کے کہن سال بزرگوں کو یاد تھی اور میر صاحب کا انداز مرثیہ خوانی فراموش نہیں ہوا تھا۔"

لطائف

میر انیسؔ کو ایک امیر نے مدعو کیا۔ کھانے کے بعد آم آئے۔ مجمع احباب میں ایک حکیم صاحب بھی تھے کسی نے پوچھا کیوں حکیم صاحب آم کھانا کیسا ہے حکیم صاحب نے جواب دیا کہ آم کا مزاج حار ہے اور آج کل فصل بھی گرم ہے پانی گھول کر

نہیں برسا اس لئے احتیاط مناسب ہے۔ اس دوران میں احباب نے اچھے آم چھانٹ کر کھانا شروع کر دیئے۔ حکیم صاحب نے چند آم ایک قاب میں علٰحدہ رکھ لئے تاکہ دلجمعی سے سیر ہو کر کھائیں کسی نے کہا۔ "حکیم صاحب ہمیں تو آم کھانے سے منع کرتے تھے اور اپنے لئے یہ سامان جمع کرتے ہیں"۔ حکیم صاحب بولنے بھی نہ پائے تھے کہ میر انیس نے فرمایا۔ "فِعْلُ الْحَکِیْمِ لَا یَخْلُوْا عَنِ الْحِکْمَۃِ (یعنی حکیم کا کوئی فعل حکمت سے خالی نہیں)

جناب عشق میر صاحب کے ایک ہم عصر شاعر اور رشتہ دار تھے اتفاق سے کچھ بے لطفی ہو گئی اور طرفین کی بیگمات نے بات بڑھا دی۔ ایک روز جناب عشق کا ذکر آیا میر صاحب برافروختہ ہو رہے تھے فرمایا میں عشق کو خوب جانتا ہوں، انکو پہلے ایک بات نکالنا اور پھر رونا دھونا خوب آتا ہے۔

عشق ہے تازہ کار تازہ خیال ہر جگہ اس کی اک نئی ہے چال
کہیں آنسو کی یہ روایت ہے کہیں یہ خونچکاں حکایت ہے

یہ اشعار میر تقی میر کے ہیں لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اسی موقع کے لئے کہے تھے۔

مرزا دبیر نے ایک بے نقط مرثیہ کہا جس کا مطلع ہے۔

مہرِ عَلَم سرورِ اکرم ہوا طالع

ایک صاحب نے میر انیس سے ذکر کیا کہ مرزا دبیر نے ایک مرثیہ کہا ہے جس میں اوّل سے آخر تک کوئی حرف نقطہ دار نہیں آیا ہے۔ میر صاحب مسکرا کر بولے۔ یہ کہئے سر سے پاؤں تک مہمل ہے۔ جو لوگ جانتے تھے کہ اس صنعت کو مہملہ کہتے ہیں وہ میر صاحب کے

لطف بیان سے محظوظ ہوئے۔

مفتی میر عباس اور جناب انیس میں قلبی محبت تھی کسی بات پر کچھ شکر رنجی ہوئی۔ مفتی صاحب نے ایک رقعہ میر انیس کے پاس روانہ کیا۔ انیس نے لفافہ پر یہ لکھ کر واپس کر دیا۔

شعر

مرنجان دلم را کہ ایں مرغ وحشی　　　زبامے کہ برخاست مشکل نشیند

میر صاحب کے زمانہ میں رعایت لفظی کی بلا لکھنؤ پر مسلط تھی اور اُسکے اثر سے مجبور ہو کر میر صاحب بھی بعض اشعار میں اس رعایت کا لحاظ کرتے تھے کسی شخص نے میر صاحب سے پوچھا کیا آپ رعایت لفظی کو پسند کرتے ہیں۔ فرمایا کیا کروں لکھنؤ میں رہنا ہے۔

حکایات

ایک نواب صاحب میر انیس کی خدمت میں مرثیہ کی مشق فرما رہے تھے۔ اتفاق سے کھجلانے کی ضرورت ہوئی ضبط نہ کر سکے۔ دامن ہٹا کر بیٹھ کھجلانے لگے۔ میر صاحب نے کنکھیوں سے دیکھا اور خاموش ہو رہے جب کھجلانے کا سلسلہ دیر تک جاری رہا۔ میر صاحب کا چہرہ سُرخ ہو گیا اور فرمایا کہ مرثیہ رکھ دو اور اچھی طرح کھجلا لو۔ مرثیہ پڑھنے اور اس بدتمیزی سے کیا علاقہ۔ نواب صاحب نے

لطف بیان سے محظوظ ہوئے۔

مفتی میر عباس اور جناب انیس میں قلبی محبت تھی کسی بات پر کچھ شکر رنجی ہوئی۔ مفتی صاحب نے ایک رقعہ میر انیس کے پاس روانہ کیا۔ انیس نے لفافہ پر یہ لکھ کر واپس کر دیا۔

شعر

مرنجان دلم را کہ ایں مرغ وحشی　　ز بامے کہ برخاست مشکل نشیند

میر صاحب کے زمانہ میں رعایت لفظی کی بلا لکھنؤ پر مسلط تھی اور اُسکے اثر سے مجبور ہو کر میر صاحب بھی بعض اشعار میں اس رعایت کا لحاظ کرتے تھے کسی شخص نے میر صاحب سے پوچھا کیا آپ رعایت لفظی کو پسند کرتے ہیں۔ فرمایا کیا کروں لکھنؤ میں رہنا ہے۔

حکایات

ایک نواب صاحب میر انیس کی خدمت میں مرثیہ کی مشق فرما رہے تھے۔ اتفاق سے کھجلانے کی ضرورت ہوئی ضبط نہ کر سکے۔ دامن ہٹا کر بیٹھ کھجلانے لگے۔ میر صاحب نے کنکھیوں سے دیکھا اور خاموش ہو رہے جب کھجلانے کا سلسلہ دیر تک جاری رہا۔ میر صاحب کا چہرہ سُرخ ہو گیا اور فرمایا کہ مرثیہ رکھ دو اور اچھی طرح کھجلا لو۔ مرثیہ پڑھنے اور اس بدتمیزی سے کیا علاقہ۔ نواب صاحب نے

معافی چاہی میر صاحب نے فرمایا "نہیں صاحب کھجلائیے اور اچھی طرح کھجلائیے۔" آپ نے مرثیہ کی تعلیم دھرپد اور پٹے کی تعلیم سمجھی ہے کہ گاتے بھی جاتے ہیں اور کھجلاتے بھی جاتے ہیں۔

ایک مرتبہ میر صاحب کی طبیعت کسلمند تھی آواز خستہ ہو گئی تھی۔ شائقین نے مجلس پڑھنے کا اصرار کیا۔ آپ منبر پر تشریف لے گئے اور حسب ذیل رباعی فی البدیہہ تصنیف کر کے پڑھی۔

ہر چند کہ خستہ و حزیں ہے آواز　　پر تعزیہ دار شاہ دیں ہے آواز
نکلے نہ اگر کنج دہن سے تو بجا　　ماتم کے ہیں دن سوگ نشیں ہے آواز

گرمی کا موسم تھا اور مشتاقوں کے ہجوم نے مجلس میں سانس لینا دشوار کر دیا تھا۔ میر صاحب نے ارشاد فرمایا۔

دھوپ آ کے یہاں پہ زرد ہو جاتی ہے　　آندھی آئے تو گرد ہو جاتی ہے
آہوں کے ہیں پنکھے آنسوؤں کا چھڑکاؤ　　یاں گرم ہوا بھی سرد ہو جاتی ہے

میر صاحب کے باکمال نواسے پیارے صاحب رشید کا عنفوان شباب کا زمانہ اور مشق سخن کی ابتدا تھی۔ انھوں نے غزل کہی۔ نانا کے پاس اصلاح کو لے گئے۔ مصرع طرح یہ تھا۔ ع

وصل کی شب اُن سے باتوں میں سحر ہو جائے گی

جدامجد کو خوش پاکر عرض کی کہ آپ بھی اسی طرح میں غزل کہیں پیارے نواسے کو گلے لگاکر فرمایا "بیٹا مرثیہ ہماری غزل ہے اچھا ابکی مجلس میں تمھاری خوشی کریں گے اور غزل پڑھیں گے۔ چندروز کے بعد دل آرام کی بارہ دری میں مجلس تھی، دو رباعیاں پڑھنے کے بعد فرمایا کہ پیارے ہماری غزل سنو" اور اُس زمین میں ایک دردانگیز سلام پڑھا جس کا ایک شعر مؤلف حیاتِ رشید نے اس حکایت کے ساتھ اپنی دلچسپ تالیف میں نقل کیا ہے۔

سکتے تھے سرور علی اکبر کا مرنا ہائے ہائے کیا غضب ہوگا جو صغرا کو خبر ہو جائے گی

میر صاحب کے سامنے کسی شخص نے جرأت کا یہ شعر پڑھا۔

ہمارے سر پہ چھائی ہیں بلائیں شام ہجراں کی وہ اپنے شغل میں ہیں بال ادھر کھولے ادھر باندھے

آپ نے بہت تعریف کی اور اپنے دونوں ہاتھ کانوں کے پاس لیجا کے اور چاروں انگلیوں کو یکے بعد دیگرے ایک دوری حرکت دے کر دوسرے مصرعہ کو اس طریقہ سے ادا کیا کہ آراستگی زلف کی تصویر حاضرین کے سامنے کھنچ گئی۔

داروغہ اچھے صاحب ایک بزرگ لکھنؤ میں میر صاحب کے شاگرد تھے سال بھر بعد ایک مجلس بڑی دھوم دھام سے کرتے اور تمام رؤسا شہر اور شرفا کو بلاتے تھے ان کو مرثیہ خوانی کا بڑا دعویٰ تھا۔ ایک مرتبہ میر انیس کا نیا مرثیہ پڑھے۔ میر صاحب بھی موجود تھے داروغہ صاحب نے اپنی دانست میں مرثیہ خوانی کے خوب جوہر دکھائے اور بڑے فخر و مباہات سے مرثیہ تمام کیا۔ جب مجلس ختم ہوگئی میر صاحب نے اپنے ایک حاضر باش سے فرمایا کہ آپ نے داروغہ صاحب کا پڑھنا دیکھا انھوں نے تعریف کی میر انیس کا چہرہ غصہ سے

سُرخ ہوگیا اور بولے تم ایسا کہتے ہو میرے مرثیہ کی ہڈیاں پسلیاں توڑ دیں میرے
مضامین پر ظلم کیا میرے قلب پر جو کچھ صدمہ گذرا ہے اُس کو میں ہی خوب جانتا ہوں
یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ داروغہ صاحب کی فینس آگئی۔ میر صاحب فرمانے لگے دیکھئے
یہاں بھی مجھ سے داد لینے آئے ہیں لیکن جوں ہی داروغہ صاحب فینس سے اُترے
میر انیس نے فرمایا کہ " اچھے صاحب آج کی مجلس یادگار پڑھے ہو۔ میں حیران ہوں کہ
میرے خیالات شاعری کے لئے تم میں جذبات خواندگی کہاں سے پیدا ہو جاتے ہیں۔
داروغہ صاحب نے تسلیم کی اور بیٹھے۔ میر انیس نے پھر سلسلۂ تعریف شروع کیا۔
داروغہ صاحب کھڑے ہو گئے پھر فراشی سلام کیا۔ اس ترکیب سے داروغہ صاحب
کو دس پانچ مرتبہ اُٹھ بیٹھ کرنا پڑی۔ پھر میر صاحب نے اپنے صاجزادے کو بلوایا
اور اُن سے مخاطب ہو کر تعریف شروع کی " کیوں خورشید علی تم نے اچھے صاحب
کا پڑھنا سنا " صاجزادے نے بھی تعریف کی۔ میر صاحب نے فرمایا کہ " خدا جانے
آج تک اس مرثیہ کو میں کیا پڑھا اور تم کیا پڑھے۔ مرثیہ کے جوہر تو آج داروغہ صاحب
کے پڑھنے سے کھلے ہیں "۔ داروغہ صاحب اس مبالغہ پر پھول گئے۔ اور حقیقت امر کو
نہ سمجھے۔

شاہنامہ اودھ جان عالم واجد علی شاہ کو خیال ہوا کہ شاہنامہ کے
طرز پر اُن کے خاندانی حالات نظم کئے جائیں اس خدمت کے لئے چار شعراء تجویز
ہوئے یعنی فتح الدولہ برق۔ تدبیر الدولہ آسیر۔ مرزا مہدی قبول اور میر ببر علی انیس
اور یہ بات قرار پائی کہ تھوڑا تھوڑا حصہ تاریخ کا ان چاروں شعراء کو تقسیم کر دیا
جائے تاکہ کتاب جلد تمام ہو اور شاعر کی طبیعت کا رنگ بھی علیحدہ علیحدہ نظر

آئے۔ چنانچہ جب جانعالم واجد علی شاہ نے یہ خدمت میر انیس کے بھی سپرد کرنی چاہی کہ وہ شاہنامہ کے طرز پر شاہان اودھ کے حالات نظم کریں تو انھیں دربار میں طلب کیا گیا اور ان کے سامنے یہ تجویز پیش کی گئی۔ میر انیس نے اخلاقاً اقرار کر لیا، بادشاہ نے نواب علی نقی خاں وزیر کی جانب اشارہ کیا کہ میر صاحب کے ہمراہ جا کر مصاحب منزل کے تمام کمرے دکھائیں جو کمرہ میر صاحب کو پسند ہو اس میں ان کے قیام کے لئے تمام سامان راحت فراہم کر دیا جائے۔ میر صاحب کو جب یہ معلوم ہوا کہ شاہنامہ لکھنے کی خدمت پابندی کے ساتھ یہاں رہ کر کرنا پڑے گی تو بے دل ہو گئے۔ جانے کو تو وہ علی نقی خاں کے ساتھ مصاحب منزل کے کمرے دیکھنے کے لئے چلے گئے۔ اور ایک ایک کمرہ دیکھا لیکن جب سب کمرے دیکھ چکے تو کہا۔

غریبوں کی کیا موت کیا زندگی   جگہ جس جگہ مل گئی مر رہے

اور بہزار دقت اس خدمت سے انکار کر دیا۔ شاہنامہ کا سلسلہ شروع ہونے بھی نہ پایا تھا کہ زمانہ نے سلطنت کا ورق ہی اُلٹ دیا اور لکھنؤ کا سہاگ اُجڑ گیا۔

بھائیوں سے محبت

محاسن انیس میر انیس اپنے بھائیوں میں سب سے بڑے تھے، مونس اور انس دونوں اُن سے چھوٹے تھے، مونس کو وہ اپنے ہمراہ رکھتے تھے اور انس کے مقابلہ ہی میں نہیں بلکہ اپنی اولاد کے مقابلہ میں مونس کو بہت زیادہ چاہتے تھے۔ مونس ان کے شاگرد بھی تھے۔ اور میر صاحب ان پر خاص توجہ فرماتے تھے۔ بھائی سے اس قدر زیادہ محبت و شفقت ہونے کی وجہ سے، ان کے بیٹے خورشید علی نفیس ہمیشہ رشک کیا کرتے تھے اور کہا کرتے تھے۔

"ہمارا مرثیہ باداجان کی اصلاح سے ہمیشہ محروم رہتا ہے اور چھوٹے چچا کے مرثیہ پر فوراً اصلاح ہوجاتی ہے۔"

میر صاحب کی توجہِ خصوصی کا ہی یہ نتیجہ تھا کہ میر مونس کے کلام کی اتنی شہرت ہوئی کہ انھیں یہ خیال ہوگیا کہ مرثیہ کہنا کوئی بڑی بات نہیں۔ چنانچہ ایک مرتبہ ان کی زبان سے نکلا کہ مشاقوں کے نزدیک ایک شب میں سو پچاس بند مرثیہ کے کہہ لینا کوئی بڑی بات نہیں۔ غمازوں نے یہ فقرہ میر انیس کے کان تک پہنچا دیا۔ اور خدا جانے کس عنوان سے کہا کہ میر صاحب کے دل کو ٹھیس لگی اور انھیں مونس کی طرف سے رنج و ملال ہوا۔ اتفاق سے اسی زمانہ میں میر مونس نے ایک نیا مرثیہ کہا اور اصلاح کی غرض سے میر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ میر صاحب اس وقت دیوان خانہ کے حوض میں غسل کر رہے تھے، میر مونس تسلیم کر کے بیٹھ گئے۔ میر انیس نے دریافت کیا کہ اس وقت کیسے آئے۔ میر مونس نے کہا کہ مجلس کا زمانہ قریب ہے ایک نیا مرثیہ کہا ہے جس کی اصلاح کے لئے حاضر ہوا ہوں میر صاحب مسکرائے اور فرمایا اچھا تم مرثیہ پڑھو میں سنتا ہوں۔ میر مونس نے تعمیل حکم کی اور مرثیہ پڑھنے لگے۔ میر انیس غسل کرتے جاتے تھے اور اپنی کلائیوں کو مل رہے تھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کسی گہرے خیال میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ جب میر مونس پچیس تیس بند پڑھ چکے تو فرمایا لاؤ مرثیہ مجھے دیدو۔" میر مونس نے ہاتھ بڑھا کر مرثیہ دے دیا۔ میر صاحب نے مرثیہ کو پہلے حوض میں دو تین مرتبہ غوطہ دیا اور اس کے بعد اسی کے اندر چھوڑ دیا۔ اور فرمایا کہ اس مرثیہ میں کیا ہے جسے اتنی بڑی مجلس میں پڑھنے کا ارادہ کیا ہے۔ یہ کہہ کر حوض سے باہر تشریف لے آئے اور

زنانے مکان میں چلے گئے۔ میر مونس سکتہ میں بیٹھے رہ گئے۔ کچھ تصنیف کے ضائع ہونے کا ملال اور کچھ بھائی کی ملامت کا اثر، عجیب کشمکش میں تھے۔ تھوڑی دیر میں میر صاحب نے بھائی کو بلا بھیجا، میر مونس گئے، دسترخوان بچھا ہوا تھا، میر صاحب بھائی کا انتظار کر رہے تھے، دیکھتے ہی کہنے لگے میں جانتا ہوں مرثیہ کا غم تمھیں بہت ہے مگر خیر آؤ کھانا تو کھا لو، میر مونس دسترخوان پر بیٹھ گئے اور کھانا کھانے لگے۔ میر صاحب مسکراتے جاتے اور مونس سے باتیں کرتے جاتے تھے۔ اثنائے گفتگو میں فرمایا بھائی اتنا غم کیوں کرتے ہو۔ ماشاءاللہ جوان آدمی ہو کیا بڑی بات ہے۔ مجلس کو کئی روز باقی ہیں۔ دوسرا مرثیہ کہہ لو۔ میر مونس نے عرض کی حضور خوب جانتے ہیں کہ مجھ میں اس قدر قوت شاعری نہیں ہے۔ میر انیس نے فرمایا پھر کس بھروسے پر کہا تھا کہ سو پچاس بند ایک رات میں کہہ لینا کوئی بڑی بات نہیں۔ میر مونس کو اپنا قول یاد آیا نہایت محجوب ہوئے۔ کھانے سے فراغت کے بعد میر انیس پلنگ پر تشریف لے گئے۔ ایک بھائی اور دونوں فرزندوں کو حکم ہوا کہ پلنگ کے قریب کرسیوں پر بیٹھیں۔ کاغذ ہر ایک کے ہاتھ میں دیا گیا اور سلسلہ تصنیف شروع ہوا۔ اور یہ مرثیہ میر مونس کے نام مشہور ہو گیا۔

مجلس افروز ہے مذکور وفاداری حُر

یہ مرقع مرثیہ حُر کی وفاداری پر ہے، اور اپنی سلاست، روانی، تسلسل بیان کے اعتبار سے خوب ہے۔ ایک بند جس میں حُر عاشورہ کی شب میں صبح ہونے کے منتظر ہیں تاکہ خیریت سے صبح ہو اور وہ حضرت امام حسینؑ کے حضور میں حاضر ہوں۔ سننے کے قابل ہے۔

متردّد، متفکّر، د متحیّر، بے چین　　تھی دعا دل میں نبیِ فاطمہ کا نورالعین
تھرتھراتا تھا سیدانیاں کرتی تھیں جو بین　　طپشِ دل کا تقاضا تھا کہ چل سوئے حسین

صبح اعدا میں نہ شاہِ شہدا گھر جائیں
شب کو مل جائے جو خورشید تو دن پھر جائیں

ایک مرتبہ میر انیسؔ سے کسی صاحب نے کہا کہ آپ کے خاندان میں اپنے اپنے مذاق کے موافق سب نے مرثیے کہے ہیں۔ اگر ایک ہی مضمون اور ایک ہی بحر میں آپ، میر نفیس، اور میر مونس مرثیہ کہیں تو بڑی دلچسپی سے لوگ سنیں گے۔ چنانچہ یہ بات طے ہوگئی کہ حضرت زینب کے بیٹوں کی جنگ کو مع تشبیب صبح ایک بحر میں لکھا جائے اور چند لوازم جمع کئے جائیں۔ میر انیسؔ نے یہ مرثیہ کہا۔

جب قطع کی مسافتِ شب آفتاب نے　　جلوہ کیا سحر کے رُخِ بے حجاب نے
دیکھا سوئے فلک شہِ گردوں رکاب نے　　مڑکر صدا رفیقوں کی دی اس جناب نے

آخر ہے رات حمد و ثنائے خدا کرو
اٹھو فریضۂ سحری کو ادا کرو

اور میر نفیس نے یہ مرثیہ لکھا۔

جب عابدوں کو طاعتِ رب میں سحر ہوئی　　تیاریٔ نمازِ جماعت اُدھر ہوئی

اور میر مونس نے اس طرح شروع کیا۔

جب آسماں پہ مہر کا زرّیں نشاں کھُلا　　پھولی شفق دریچۂ آسماں کھُلا

باپ بیٹے کی اصلاح کا مقابلہ | ایک دفعہ میر خلیق اپنے دونوں بیٹوں میر انیس اور مونس سے ملنے فیض آباد سے لکھنؤ تشریف لائے ان کے ساتھ ان کے منجھلے بیٹے

میر مہر علی انس بھی تھے۔ میر خلیق نے اُنس کے ایک مرثیہ کی اصلاح کی تھی اور وہ اپنی اصلاح کی داد لینا چاہتے تھے، انھوں نے میر انیس سے کہا ذرا انس کا مرثیہ سن لو۔ انیس نے مرثیہ سُن کر بہت داد دی اور اصلاح کی بڑی تعریف کی۔ اس کے بعد میر انیس نے کہا "باوا جان میر نواب نے (مونس) جو مرثیہ اس سال کہا ہے ذرا اسے بھی سنیئے"

مونس نے مرثیہ کہا یہ کچھ اور ہی چیز تھا۔ اس مرثیہ پر انیس کی اصلاح تھی مرثیہ کو سنانے کی غرض یہی تھی کہ باپ اپنے لائق بیٹے کی داد دیں۔ میر خلیق اپنے بیٹے کی اصلاح اور چھوٹے بیٹے کے مرثیہ سے بہت خوش ہوئے۔

آخری مرثیہ | میر صاحب کے آخری مرثیہ کے متعلق صحت کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا لیکن مراثی انیس جلد اوّل مرتبہ سید علی حیدر طباطبائی نظم لکھنوی میں جو مرثیے ہیں وہ سب آخری زمانہ کا کلام ہے، کیونکہ بہت سے ایسے مرثیے ہیں" جن میں مصنف نے خود صراحتًا یا اشارتًا یہ بات ظاہر کردی ہے کہ یہ ان کی آخر عمر کا کلام ہے یا وہ مرثیے ہیں جو آخر عمر میں نواب ابو صاحب کی مجلسوں میں جناب مرحوم نے پڑھے اور یہی مرثیے مرحوم کے آخری مرثیے تھے۔

جس دن جناب مرحوم نے منبر و مجلس کو الوداع کہی تینوں صاحبزادے سامنے حاضر تھے۔ چھوٹے فرزند میر محمد سلیس کو اشارے سے پاس بلایا۔ بستہ اپنے ہاتھ سے اُٹھا کر اُن کے ہاتھ میں دے دیا۔ سلیس مرحوم مٹیا برج و حیدرآباد کی مجلسوں میں زندگی بھر یہی مرثیے پڑھا کئے۔ یہ مرثیے منشی نولکشور کو نہ مل سکے ورنہ ان کی مرتب کی ہوئی جلدوں میں شامل ہو جاتے۔ اس کے علاوہ دو یا تین مرثیے ایسے بھی ہیں جن کا حال نظم طباطبائی کو بزرگوں سے معلوم ہوا کہ یہ جناب مرحوم کی انتہائے مشق کا کلام ہے۔ لوگوں

کی خاطر سے مرحوم کو یہ مرثیے بستے سے جُدا کرنے پڑے"۔

صاحب یادگار انیس نے حسب ذیل مرثیہ آخری زمانہ کا کلام بتایا ہے۔

واحسرتا کہ عہد جوانی گزر گیا ہنگام قوتِ ہمہ دانی گزر گیا
وہ زور شورِ سحر بیانی گزر گیا اب کیا علاج فرق سے پانی گزر گیا

پھولا ہے باغ بزم میں شیعہ بہم نہیں
افسوس مجلسیں تو وہی ہیں پہ ہم نہیں

میر صاحب کا مشہور مرثیہ "جب آسماں پہ ختم ہوا دورِ جام شب" بھی عہد پیری کا کلام ہے لیکن جو مقطع یعنی "بس اے انیس ضعف سے لرزاں ہے بند بند" درج کیا گیا ہے وہ "جب قطع کی مسافت شب آفتاب نے" کا ہے اس مرثیہ کا نہیں

آخری مجلس مولانا اشہری نے لکھا ہے کہ میر صاحب نے آخری مجلس شیش محل واقع لکھنؤ میں پڑھی اور اس مجلس میں جو مرثیہ آخری مرتبہ پڑھا وہ یہ تھا۔

"آتی ہے کس شکوہ سے رن میں خدا کی فوج"

لیکن مؤلف واقعات انیس لکھتے ہیں کہ میر صاحب نے آخری مجلس شیخ علی عباس وکیل کے مکان میں پڑھی تھی اور اس کے بعد کہیں نہیں پڑھی اور یہی روایت غالباً زیادہ صحیح ہے۔"

ترتیب و تصحیح کلام مولانا سید علی حیدر طباطبائی نظم لکھنوی نے میر انیس کے کلام کی ترتیب و تصحیح کر کے پانچ جلدوں میں نظامی پریس بدایوں سے شائع کرایا' ترتیب، کلام کی نسبت انھوں نے لکھا ہے۔

"ترتیب کلام مجھے اسی طرح اچھی معلوم ہوئی کہ پہلی اور دوسری جلد میں میر صاحب

کے وہ مرثیے شائع ہوں جو ان کی استادی کی دلیل ان کے کمال کی سند ہیں، تیسری جلد میں زمانہ شباب کا کلام ہو۔ ان کے عنفوانِ مشق و زورِ قلم کی یہ مثال اپنے اندازہ و تخمین پر بھروسہ کرکے میں نے دکھائی ہے۔ انھیں تین جلدوں میں چند مرثیے ایسے آ گئے جن میں ایسے واقعات کے نکل آئے جن کا ذکر اہل سنت و جماعت کی مجلسوں میں نہیں چاہئے۔ مثلاً حضرت رسالت و سیدہ کے حالات و وفات و واقعہ شہادت امیرالمومنین و امام حسن کے علاوہ بھی بعض مرثیوں کے رجز میں اس قسم کے مضامین دیکھ کر میں نے چوتھی جلد میں یہ سب مرثیے رکھ دئے۔ پانچویں جلد میں ابتدائی مرثیے ہیں۔" اے مومنو!" کہہ کر اکثر شروع کرتے ہیں اور کسی روایت کو نظم کرکے ختم کر دیتے ہیں مگر میر صاحب کی زبان و طرزِ بیان کی شان اس میں بھی موجود ہے۔"

" تصحیح میں زیادہ تر بھروسا پرانے قلمی نسخوں پر کیا گیا لیکن تعجب اس بات پر ہوتا ہے کہ منشی نولکشور کے سوا میر صاحب کے کلام کو جمع کرنے کا کسی کو خیال ہی نہیں آیا۔ غرض تمام مرثیوں کا قلمی ذخیرہ کسی جگہ سے ممکن نہ ہوا۔ کچھ مرثیے میرے پاس تھے۔ کچھ اور احباب سے لے کر کام نکالا۔ جن مطبوعہ مرثیوں کا قلمی نسخہ ملا ہی نہیں ان کی تصحیح میں اپنی زبان دانی و سخن سنجی سے استعانت کی مثلاً امام حسینؑ نے بچپن میں روزہ رکھا ہے جناب رسالت کی خدمت میں عرض کر رہے ہیں کہ جو بچہ پہلے پہل روزہ رکھتا ہے۔

مطبوعہ۔ کچھ کچھ اسے ماں باپ بھی کھائی بھی ہیں دیتے
حضرت بھی ہیں کچھ روزہ کشائی ہمیں دیتے

دوسرے مصرعہ کی تصحیح اس طرح کر دی۔

" حضرت ہمیں کچھ روزہ کشائی بھی ہیں دیتے"

یا مثلاً کسی غازی نے حریف کو نیزہ مارا اس نے ہاتھ پر روکا۔ نیزہ ہتھیلی میں گزرتا ہوا شانہ تک پہنچ گیا۔ اس مقام پر مصرعہ مطبوعہ یہ ہے۔

نیزہ تو ہاتھ میں گیا، ہاتھ آستیں ہوا

اس کی تصحیح اس طرح کی گئی ع

نیزہ تو ہاتھ بن گیا، ہاتھ آستیں ہوا

یا مثلاً ایک مرثیہ کا مصرع (مطبوعہ) اس طرح ہے۔

ہے بے نیاز دہن و قصارے سے شمع طور

اس کی تصحیح اس طرح کی گئی

ہے بے نیاز دہن و عصارے سے شمع طور

یا مثلاً ہبر الالم کے ذکر میں میر صاحب فرماتے ہیں (مطبوعہ)

ہبر الالم کی آگ کا روشن ہے سب یہ حال دو شخص جل کے رہ گئے تھے صورتِ غزال

اس کی تصحیح اس طرح کی گئی ع

دو شخص جل کے رہ گئے تھے صورتِ زغال

یہ سب مثالیں کاتب کی غلطیوں کی ہیں اور صاف معلوم ہوتا ہے کہ کاتب نے بھی عمداً تحریف نہیں کی ہے بلکہ رو میں کچھ کا کچھ لکھ گیا ہے۔ اس کے علاوہ اہل ادب کی مجلسوں میں میری عمر گزری ہے۔ میں نے جس طرح کسی مصرع یا بیت کو سنا ہے اُسکے خلاف اگر چھاپہ میں پایا تو تصحیح کر دی۔ مثلاً میر صاحب کے سلام کی ایک بیت مجھے اس طرح یاد ہے۔

عالم پیری میں آئے کون پاس اے عصا گر جی ہوئی دیوار ہوں

دوسرا مصرع مطبوعہ جلدوں میں اس طرح ہے۔ ع

"اے عصا گرتی ہوئی دیوار ہوں"

میر رضا حسین نگیںؔ کے پاس میر صاحب کے بہت سے سندی مرثیے ہیں ان کی عنایت سے میرے دیکھنے میں آئے۔ مطبوعہ مرثیوں کے ساتھ مقابلہ کرنے میں بھی انھوں نے میرے ساتھ زحمت اٹھائی۔ بعض مرثیے جوان کے پاس نہ نکلے ان کے مقابلہ کے لئے دلاحسین خاں صاحب برجیسؔ اور شیخ مصاحب علی کے بستہ کے مرثیہ نکلوالائے۔ نگیںؔ کے والد مرحوم میر صاحب کے خاص شاگردوں میں تھے انھیں کے ساتھ حیدرآباد میں لکھنؤ سے آئے اور یہاں ان کا منصب ہوگیا۔ خاں صاحب و شیخ صاحب میر نفیسؔ کے خاص تلامذہ میں ہیں ان کو بھی لکھنؤ چھوڑے ہوئے عمر گزر گئی۔ میر ہادی علی صاحب لکھنؤ کے قدیم شاعر و ذاکر اور میر صاحب کا کلام پڑھنے والوں میں ہیں۔ ان سے بھی قلمی مرثیے میں نے لئے اور اُن سے کام نکلا۔ نواب ضیغم جنگ بہادر میر انیس کے خاص شاگرد و مرثیہ گو ہیں۔ جناب سید محمد حسن صاحب بلگرامی صدر محاسب سرکار عالی بڑے صاحب ذوق زبان اُردو کے ادیب ہیں۔ ان دونوں صاحبوں سے چند مرثیے ملے اور مقابلہ میں کام آئے۔"

مرثیوں کی تعداد اس کے علاوہ مہذب لکھنوی نے "وقار انیسؔ" کے نام سے میر انیس کے مرثیوں کا ایک مجموعہ شائع کیا ہے تاہم ابھی تک میر صاحب کا بہت سا کلام پردۂ خفا میں ہے۔ جیسا کہ صاحب یادگار انیس نے لکھا ہے۔

" میر انیس کے مرثیوں کی تعداد کوئی بتا نہیں سکتا۔ مولف حیات انیس دس ہزار بتاتے ہیں۔ لیکن واقعات انیس کے مولف جن کو خاندان انیس سے قرابت کا شرف

بھی حاصل ہے۔ فرماتے ہیں کہ مرثیوں کی تعداد ایک ہزار تک ہے۔ کہتے ہیں کہ میر سلامت علی لکھنؤ میں ایک بزرگ تھے جن کو کلیاتِ انیس جمع کرنے کا شوق تھا انھوں نے میر صاحب کا وہ کلام بہم پہنچایا جو خود میر صاحب کے بھی پاس نہ تھا۔ ایک روز ان سے میر صاحب نے مسکرا کر دریافت کیا "کیوں صاحب میرا کلیات سب آپ نے جمع کر لیا ہوگا۔" میر سلامت علی نے عرض کی کہ حتی الامکان میں نے کوشش بلیغ کی ہے۔ میر انیس نے فرمایا "بھلا جناب عون و محمد کے حال کے کتنے مرثیے آپ کے پاس ہیں۔" میر سلامت علی صاحب نے مطلعے پڑھنا شروع کئے۔ دس پندرہ مطلعوں کے بعد میر انیس نے فرمایا کہ اچھا اب آپ خاموش رہیں۔ میں مطلعے پڑھتا ہوں آپ اقرار کرتے جائیے میر انیس نے مطلعے پڑھنا شروع کر دیئے۔ میر سلامت علی حیرت سے مُنہ دیکھتے رہ گئے۔ وہ کہتے جاتے تھے کہ یہ مرثیے میرے پاس نہیں ہیں۔ آخر کار میر صاحب نے مسکرا کر فرمایا "بس اسی تلاش پر تمھیں ناز ہے۔ بھائی کس پھیر میں پڑے ہو واللہ انیس کو خود معلوم نہیں کہ اس کی تصنیف کی حد کیا ہے۔ مجھے گمان واثق ہے کہ فیض آباد سے لکھنؤ تک میری تصنیف میں عونؓ و محمدؓ کے حال کے مرثیے دو سو سے زیادہ ہوں گے۔" کثرتِ کلام کا اندازہ اس تاریخی شہادت سے ہو سکتا ہے کہ میر صاحب خود ایک سلام کے مقطع میں فرماتے ہیں۔

فیضِ غمِ حسینؑ سے ہوتے ہیں اے انیس
ہر سال ایک حال کے دفتر جدا جدا

بہت سے مرثیے ناتمام رہ گئے۔ ان کا اب کہیں پتہ نہیں۔ کلام چھ جلدوں میں شائع ہوا ہے لیکن ابھی تک سیکڑوں مکمل مرثیے باقی ہیں جو طبع نہیں ہوئے۔

ان کے علاوہ بہت سے مرثیے اور سلام ایسے ہیں جن پر دوسروں نے تصرف کرلیا ہے، میر مونس اور میر نفیس کے متعدد مرثیے میر انیس کے کہے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ مشہور ہے کہ انھوں نے ڈھائی لاکھ اشعار کہے تھے۔ جن میں کچھ غزلیں بھی تھیں۔

مرض الموت ۲۴ رمضان ۱۲۹۱ھ کو میر صاحب بخار اور درد سر میں مبتلا ہوئے، تپ رفتہ رفتہ بڑھتی گئی۔ چند روز کے بعد ورم جگر کی شکایت بھی لاحق ہوگئی لکھنؤ کے مشہور اطبا کا علاج جاری رہا مگر "مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی"۔ آخر میں اسہال کبدی اور دق کی شکایت ہوگئی، بستر علالت پہ میر صاحب نے چند رباعیاں فرمائیں۔

درد و الم ممات کیوں کر گزرے ۔۔۔ یہ چند نفس حیات کیونکر گزرے
پیری کی بھی دوپہر ڈھلی شکر انیس ۔۔۔ اب دیکھیں لحد کی رات کیونکر گزرے

وہ موج حوادث کا تھپیڑا نہ رہا ۔۔۔ کشتی وہ ہوئی غرق وہ بیڑا نہ رہا
سارے جھگڑے تھے زندگانی کے انیس ۔۔۔ جب ہم نہ رہے تو کچھ بکھیڑا نہ رہا

آخر ہے حیات کوچ کرتا ہوں میں ۔۔۔ رخصت اے زندگی کہ مرتا ہوں میں
اللہ سے لو لگی ہوئی ہے میری ۔۔۔ اوپر کے دم اس واسطے بھرتا ہوں میں

بقول صاحب یادگار انیس یہ شعر ان کی زندگی کے آخری لمحات کا پتہ دیتا ہے۔

آخر ہے عمر زیست سے اب دل بھی سیر ہے ۔۔۔ پیمانہ بھر چکا ہے چھلکنے کی دیر ہے

یہ شعر یوں بھی مشہور ہے۔

کہئے انیس صاحب طبیعت بخیر ہے　　پیمانہ بھر چکا ہے چھلکنے کی دیر ہے

اس شعر کے متعلق روایت یہ ہے کہ کسی شاگرد نے پہلے مصرعہ میں خیریت پوچھی تو میرانیس نے دوسرے مصرع میں جواب دیا۔

وفات دنیائے مرثیہ گوئی کا یہ آفتاب عالمتاب ۲، یا ۴، سال کی عمر میں ۱۰ دسمبر ۱۸۷۴ء مطابق ۲۹ شوال اور بقول بعض ۲۹ ذی قعدہ ۱۲۹۱ھ دوشنبہ یا جمعہ کے دن مغرب کے وقت انتقال فرمایا۔ جناب غفرانمآب کے امام باڑہ میں قبلہ وکعبہ سید بندہ حسن نے نماز پڑھائی اور اپنے باغ واقع سبزی منڈی میں دفن ہوئے۔ مرزا سلامت علی دبیر نے ایک دردناک تاریخ میر باقر کے امام باڑہ کی مجلس میں پڑھی۔ چشم دید شہادت ہے کہ مرزا صاحب تاریخ کے اشعار پڑھتے جاتے جاتے تھے اور آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرتے جاتے، چند شعر یہاں لکھے جاتے ہیں۔

قطعہ تاریخ

دادخواہم یا غیاث المستغیثین الغیاث　　از کہ دل مانوس گردد بے سخنور بے انیس

عبرۃ للناظرین گر دید افلاک و زمیں　　دیدنی نبود مہ و خورشید و اختر بے انیس

یادگار رفتگاں ہستیم و مہمانِ جہاں　　چند روزہ چند ہفتہ بے برادر بے انیس

الوداع اے ذوق تصنیف الفراق اے شوقِ نظم　　شد حواسِ خمسہ و دہ عقل ششدر بے انیس

رشک را ربطے بدامن بود لیکن اشک را　　رفتہ رفتہ رفت تا دامانِ محشر بے انیس

تازہ مضموں نظم می فرمود در ہر بحر شعر　　چشمہ چشم شود ہم چشم کوثر بے انیس

سال تاریخش نبر بر دبیہ شد زیب نظم — طور سینا بے کلیم اللہ و منبر بے انیس
در سنینِ عیسوی تاریخ گفتم صاف صاف — گرچہ طبعم بود محزون و مکدر بے انیس

آسماں بے ماہ کامل سدرہ بے روح الامیں
طور سینا بے کلیم اللہ و منبر بے انیس

ایک اہل کمال نے میر انیس اور مرزا دبیر دونوں کی وفات کا مادۂ تاریخ ایک ہی مصرع میں نکالا ہے جس کے پہلے جزو سے انیس کی تاریخ وفات اور دوسرے مصرعہ سے دبیر کی تاریخ وفات نکلتی ہے۔ مصرعہ

غمِ انیس میں ہے ہے — دیا دبیر کا غم
۱۲۹۱ھ — ۱۲۹۲ھ

آخری آرام گاہ کس درجہ افسوس ناک مسئلہ ہے کہ اس بطل پرستی کے دور میں بھی اس شہنشاہ سخن کی آخری آرام گاہ اچھی حالت میں نہیں ہے اور قدردانان اُردو کی غفلتوں کا شکار ہے۔ کچھ خوش ذوق افراد کی جانب سے ۱۹۳۳ء میں مقبرہ تعمیر ہونے کی تحریک کی گئی تھی لیکن یہ تحریک ہماری غفلتوں کا شکار ہو گئی۔ کس قدر عبرتناک منظر ہے کہ جہاں کبھی فصاحت و سلاست کے پھول کھلا کرتے تھے آج وہاں خس و خاشاک کا ڈھیر ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ اُردو زبان کے شیدائی اپنے اس سب سے بڑے شاعر کی یادگار اس کی شایان شان قائم کریں۔ اور جس کا شاعر اعظم ہر آئینہ مستحق تھا۔

نام نیکِ رفتگاں ضائع مکن — تا بماند نام نیکت برقرار

میرانیس کی شاعری کا پس منظر

قبل اس کے میرانیس کی شاعری کی خصوصیات کے متعلق کچھ لکھا جائے بہتر معلوم ہوتا ہے کہ علامہ شبلی کی وہ رائے لکھ دی جائے جو انھوں نے میرانیس کی شاعری کی خصوصیات سمجھنے کے لئے ضروری بتائی ہیں ۔ علامہ فرماتے ہیں۔

" میرانیس کا خاندان دلی کا خاندان تھا اگرچہ ان کے دلدا میرضاحک دلی سے چلے آئے تھے اور فیض آباد میں سکونت اختیار کرلی تھی تاہم دہلی کی جو خصوصیات تھیں وہ اخیر تک اس خاندان میں قائم رہیں۔ میرانیس اکثر موقعوں پر ناز کے لہجے میں کہتے تھے " صاحبو ارباب لکھنؤ اس طرح نہیں بولتے یہ میرے گھر کی زبان ہے ۔ اس بنا پر جا بجا جگہ کو جاگہ " لکھا ہے اور یہ صرف تحریری زبان نہیں ۔ وہ یوں ہی بولتے بھی تھے۔ میں نے اپنے معزز دوستوں سے جو میر صاحب کی صحبت میں اکثر شریک رہا کئے ہیں سنا ہے کہ جب کبھی ان کی مجلس میں لوگ صف نعال میں آکر بیٹھتے تھے تو فرماتے تھے صاحبو جاگہہ ادھر ہے۔ افعال کو فاعل کی سطابقت سے جمع لکھنا بھی دہلی ہی کا اثر ہے ۔ مثلاً ع جلدی میں گو جوانوں نے چوٹیں بچائیاں "!

میر صاحب نے شاعری میراث میں پائی تھی ان کے جو خاص جوہر ہیں وہ میراث ہی کی یادگار ہیں۔ ان کے دادا میر حسن گو غزل بھی کہتے تھے لیکن جس چیز نے ان کو عالم شہرت کا تاجدار بنایا وہ ان کی مثنوی " بدر منیر " ہے۔ اس مثنوی کا خاص وصف واقعات اور کیفیات کا سین دکھانا ہے۔ وہ جس واقعہ یا حالت کو لکھتے ہیں اسکا سماں باندھ دیتے ہیں ۔

میر انیس کے مرثیوں میں واقعات اور کیفیات کی تصویر کھینچ دینے کی جو خصوصیت ہے دادا کی میراث ہے۔ البتہ یہ فرق ہے کہ میر حسن واقعہ نگاری کی وسعت میں ابتذال اور عامیانہ بول چال کی پروا نہ کرتے۔ میر انیس نے واقعہ نگاری اور مصوری کے ساتھ بندش کی چستی اور خواص کی طرز گفتگو کی خصوصیت بھی قائم رکھی اور یہ قادر الکلامی کی انتہا ہے۔

میر حسن صاحب غزل گوئی میں اگرچہ سودا اور میر درد کے شاگرد تھے لیکن سودا کا پرتو ان پر نہیں پڑا۔ صرف میر درد کا رنگ ہے یعنی روزمرہ، صفائی، گھلاوٹ اور درد۔ یہی باتیں میر انیس صاحب کے یہاں بھی ہیں۔ جو لوگ کہتے ہیں کہ میر انیس صرف بین لکھنا جانتے ہیں اس جھوٹ میں سچ بھی ہے یعنی بین رزم سے بہتر لکھتے ہیں۔ یہ وہی خصوصیت ہے جو دادا سے انھیں ترکہ میں ملی ہے۔

میر انیس کی شاعری کے متعلق یہ مسئلہ نہایت مہتم بالشان مسئلہ ہے کہ مرزا کی رقابت اور مقابلہ نے ان کے کلام پر کیا اثر پیدا کئے۔ اگر یہ پتہ لگ سکتا کہ دونوں حریفوں میں سے کس نے میدان شاعری میں قدم رکھا اور خاص خاص مرثیے بلکہ خاص خاص بند جو دونوں کے یہاں قریب المعنی پائے جاتے ہیں اول کس نے کہے تو شاعری کی تاریخ کے بہت سے دقیق نکتے حل ہوتے ہیں لیکن افسوس ہے کہ باوجود بہت جدوجہد کے اس بارہ میں مجھ کو کچھ کامیابی نہیں ہوئی۔

دونوں حریفوں کے مرثیوں کو دیکھو تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ ایک نے دوسرے کے کلام کو سامنے رکھ کر لکھا ہے۔ لیکن زمانے کے تقدیم و تاخیر کے نہ معلوم ہونے سے یہ نہیں متعین ہوتا کہ ایجاد کا فخر کس کو ہے اور کس نے کس سے کیا اثر

اڑلیا ہے، میرانیس جابجا فخریہ شعروں میں اس بات کا اشارہ کرتے ہیں کہ ان کے حریف ان کے کلام سے فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ مثلاً ؎

لگا رہا ہوں مضامین نو کے پھر انبار ۔۔۔ خبر کرو مرے خرمن کے خوشہ چینوں کو

نو اسنجیوں نے تری اے انیس ۔۔۔ ہر ایک زاغ کو خوش بیاں کر دیا

ملتی نہیں دزد ان معانی سے نجات ۔۔۔ سچ ہے مگس سے کب شکر بچتی ہے

ان چوٹوں کو سن کر مرزا دبیر صاحب برابر کا جواب نہیں دیتے یعنی یہ نہیں کہتے کہ میں نہیں میرا حریف سرقہ کرتا ہے بلکہ صرف تبرّی کرتے ہیں کہ میں اس جرم کا مرتکب نہیں چنانچہ فرماتے ہیں ؎

شکر خدا کہ سرقہ کی حد سے بعید ہوں ۔۔۔ ہر مرثیہ میں موجد طرزِ جدید ہوں

ہے استخارہ مجھ کو احادیث و سیر سے ۔۔۔ یعنی بری ہوں سرقۂ مضمون غیر سے

اس سے اتنا ضرور ثابت ہوتا ہے کہ میر انیس مرزا صاحب کے مقابلہ کا قصد نہیں کرتے تھے اور ان کے مرثیوں کا جواب لکھنا نہیں چاہتے تھے ورنہ مرزا صاحب اس کا اشارہ کرتے۔ اس کے ساتھ جب بعض مرثیوں سے صاف ثابت ہے کہ وہ ایک دوسرے کے مقابلہ پر لکھے گئے تو خواہ مخواہ ماننا پڑتا ہے کہ مقابلہ اور ہم طرحی و مسابقت کی کوشش مرزا صاحب ہی طرف سے ہوتی تھی۔ میر انیس نے اسکی طرف ایک موقع پر اشارہ کیا ہے چنانچہ کہتے ہیں ؎

بھلا تردد بیجا سے اس میں کیا حاصل ۔۔۔ اٹھا چکے ہیں زمیندار جن زمینوں کو

جن مرثیوں یا اشعار یا مضامین میں تقابل یا توارد ہے ان کی تفصیل آگے آئے گی وہاں اس تمہیدی بحث کو پیش نظر رکھنا چاہئے۔

میر انیس کا جو کلام موجود ہے وہ ۵ جلدوں میں شائع ہوگیا ہے لیکن میر صاحب کے متوسلین کا خاص دعویٰ ہے کہ ان مرثیوں میں بہت کچھ تحریف اور غلط ہوا ہے۔ مولوی عبد الغفور نساخ نے ایک رسالہ مرزا دبیر، میر انیس کے اغلاط کے متعلق لکھا تھا اُسکا جواب مرزا محمد رضا متخلص بہ معجز شاگرد ناسخ نے لکھا جسکا نام تطہیر الاوساخ ہے اور جو ۱۲۹۶ھ میں شعلۂ طور کانپور میں چھپا تھا اس کے دیباچہ میں مرزا رضا صاحب لکھتے ہیں۔

"ثانیاً یہ بات بھی کالنار علی العلم ہے کہ اکثر تلامذہ میر صاحب و مرزا دبیر صاحب نے بہ لحاظ اپنے پڑھنے کے اکثر تصرفات بہ تغیر و تبدل الفاظ و مصرعہ و بند کے کئے ہیں بہ نظر اختصار کسی مرثیے کے کچھ بند نکال ڈالے اور کہیں درمیان مرثیے میں کوئی مطلع یا بند ایجاد کرکے الحاق کیا تاکہ وہیں سے پڑھنا شروع کریں کہیں بغرض بجا و ابجا مضامین سکیہ موزوں کرکے شامل مرثیہ کئے، کہیں الفاظ میں موافق اپنے فہم و سلیقہ کے کمی و بیشی کی، یا مشتاقین نے جو مرثیہ جدید زبان سے ان صاحبوں کی مجلس میں سنا خفیہ تحریر کیا اور جو الفاظ یا مصرع بہ سبب عجلت تحریر یا عدم سماعت کے رہ گئے، اس کی تکمیل بطور خود کی، اس باعث نقل مرثیہ جدید و نو تصنیف کا دستیاب ہونا شاعرین سے غیر ممکن تھا پس جو کچھ کہ مرثیے ان کے تلامذہ کے پاس ہیں ان میں اکثر کا لاصل نہیں ہیں۔ تغیر و تبدل و اضافہ و نقصان ان میں بہت ہے اور انھیں مرثیوں کی نقل وہ مرثیے ہیں جو مطبوع ہوئے ہیں پس مراثی مطبوعہ میں قبیل البناء الفاسد علی الفاسد ہیں"۔

اس بنا پر مرزا صاحب نے میر نفیس صاحب سے جو میر انیس کے فرزند رشید

تھے مطبوعہ مرثیوں کی تصحیح کی جس کا نتیجہ حسب ذیل ہے ۔

یہ مرثیہ ع اے تیغ زباں جوہر تقریر دکھادے اس مرثیہ تک ملنے لگی آنکھیں قدم سرور دیں پر میر صاحب کا کلام ہے ۔ باقی ۱۴۵ سے لیکر ۱۵۵ تک اور مقطع کے دو اول مصرعے سب الحاقی ہیں ۔

یہ مرثیہ ع دشت و دغا میں نور خدا کا ظہور ہے شتربند تک یعنی اس ٹیپ تک مصرع ع چھاتی کے پار نیزہ کی نوکیں نکل گئیں ، میر صاحب کا کلام ہے باقی الحاق ہے ۔ یہ شعر

لپٹوں گلے سے میں پدرِ ناتواں کے سینہ سے تو سرک تو مرے باباجان کے

الحاقی ہے (بعد میں مولانا علی حیدر طباطبائی نے کلام کی ترتیب و تصحیح چار جلدوں میں شائع کی جو نظامی پریس بدایوں سے بڑے اہتمام کے ساتھ شائع ہو چکی ہیں)

مرزا صاحب نے اور بہت سے اعتراضات کے جواب میں جو خاص خاص الفاظ یا تراکیب پر تھے ان الفاظ اور تراکیب سے انکار کیا ہے اور کہا ہے کہ اصل مرثیہ میں یوں نہیں یوں ہے ۔ چونکہ اس قسم کے الفاظ نہایت کثرت سے تھے اسلیے ہم ان کو قلم انداز کرتے ہیں ۔ ناظرین چاہیں تو اصل رسالہ کو ملاحظہ فرمائیں ۔

ہم کو اس سے انکار نہیں کہ مطبوعہ مرثیے نہایت غلط چھپے ہیں لیکن مرزا صاحب نے تو یہ غضب کیا ہے کہ جہاں کوئی لفظ یا محاورہ حال کے خلاف آیا اس کے وجود سے انکار کر دیا حالانکہ یہ تعمیم صحیح نہیں ؛ میر انیس نے ۷۰ برس کی عمر پائی انکی ابتدائے مشق میں قدیم محاورے اور غلط الفاظ نہایت کثرت سے متداول تھے اور شعرا بے تکلف ان کو استعمال کرتے تھے ۔ شیخ ناسخ نے البتہ اس قسم کے تمام الفاظ کو ترک

کر دیا تھا، لیکن جو لوگ اپنے تئیں دلّی کی طرف منسوب کرتے تھے وہ ان الفاظ و محاورات کو وطن کی یادگار سمجھتے تھے۔ چنانچہ غالب و ذوق جو خاتم الشعراء ہیں ان کے ہاں وہ الفاظ بے تکلف ملتے ہیں جن کو شیخ ناسخ مدتوں سے چھوڑ چکے تھے مثلاً مرزا غالب فرماتے ہیں ؎

ع ستم کش مصلحت سے ہوں کہ خوباں تجھ پہ عاشق ہیں

حالانکہ اس قسم کی جمع ایک مدت سے متروک ہے۔ اس قسم کے الفاظ میر انیس کے ہاں بھی ہیں اور کثرت سے ہیں لیکن وہ ابتدائے مشق کے ہیں ورنہ شیخ ناسخ کے اثر یا خود مذاق کے بدلنے سے جس قدر زمانہ گزرتا گیا میر صاحب قدیم مخصوص الفاظ و تراکیب چھوڑتے گئے۔"

ہم یہاں میر انیس کے چند متروک الفاظ پیش کرتے ہیں جن کو میر انیس برابر استعمال کرتے رہے حالانکہ شیخ ناسخ نے ان میں سے بہت سے الفاظ کی تصحیح اسی زمانہ میں کر دی تھی۔

متروک الفاظ جاگہ، جائے، جایا، بہنا، تلے، ہات، لال۔ روکیو، جانیو، کیجو، دیجو، کہیو، ڈوباؤ، جیوں، سو، ہے گا، اسواری، سسرا، جن۔

میر صاحب اہل دہلی کے خلاف 'فکر' اور 'سانس' کو ہمیشہ مؤنث لکھتے تھے البتہ بیگمات کی خاص زبان کو ترجیح دیتے تھے۔

چند الفاظ اور ان کا استعمال

ردّ و بدل۔ مؤنث)

وہ خود بیں تو یہ سپہر آہنیں میں تھی اس دن غضب کی ردّ و بدل کفر و دیں میں تھی

حلق ۔ مذکر

آج احمدؐ و حیدرؑ کے گریبان پھٹیں گے اٹھارہ بنی فاطمہ کے حلق کٹیں گے

حرم ، ناموس (مذکر)

ناموس مصطفےٰ اسے روکا کئے کمال لیکن رکا کسی سے نہ ہرگز وہ خوردسال
ڈیوڑھی پہ جو ناقوں کو بٹھایا حرمؑ اترے بچے لئے ناموس امام امم اترے

تبرکات (واحد)

موقعہ نہیں بہن ابھی فریاد و آہ کا لاؤ تبرکات رسالت پناہ کا

قامت (مؤنث)

سرو شرمائے قد اس طرح کا قامت ایسی اسداللہ کی تصویر تھے ، صورت ایسی

مقال (مذکر)

بی بیوں سے کیا زینب نے جو رو کر یہ مقال صف ماتم سے وہ گھبرا کے اٹھیں سب فی الحال

جھانجھ (مذکر)

سن کر دُہل کا شور کلیجے دہلتے تھے تھرّا کے جھانجھ بھی کفِ افسوس ملتے تھے

چکا چوند (یعنی چکا چوند میں مبتلا)

ان چاند سے چہروں کا جو ہے عکس زمین پر خورشید چکا چوند ہے واں عرش بریں پر

والدہ صاحب (بجائے والدہ صاحبہ)

دونوں نے کہا جوڑ کے ہاتھوں کو یہ اکبار اے والدہ صاحب یہ نہ فرمائیے زنہار

بغی (بجائے باغی)

تب اس لعین نے چین بجبیں ہو کے یہ کہا حاکم سے جو بغی ہو مجھے اس سے کام کیا

خوشی ہونا (خوش ہونے کی جگہ)

مادر کے رُخِ پاک کو تکنے لگے اصغر — جھولے میں خوشی ہو کے ہمکنے لگے اصغر

اس مژدہ کو سُنتے ہی خوشی ہو گئی شیریں

باری (بجائے بار)

آتش میں صف لشکر تاری نظر آئی — حملوں میں قیامت کئی باری نظر آئی

اُتارا = اُترنا

فوج آئی ہے جلدی کرو ساحل سے کنارا — ہو گا لب جو شام کے لشکر کا اتارا

ہتوانسا = ہاتھ میں پکڑنا

ہتوانس کے تیغ و سپر اکبر یہ پکارے — کیا بکتے ہو بیہودہ سخن منہ پہ ہمارے

شمشیر اگلنا = تلوار سونتنا، تلوار چلانا

کس قہر سے دیکھا طرف لشکر بے پیر — بل آگیا ابرو پہ اگلنے لگے شمشیر

جو اگر۔ (جو زائد)

خادم شہ دیں کے ہیں تو عباس علی ہیں — اس عہدہ کے لائق ہے جو اگر ہیں تو وہی ہیں

رندھنا = رنجیدہ ہونا، دیگر ہونا۔

کرتی بھی بیاں زوجۂ مسلم یہی پیہم — کیا ہے کہ رندھی جاتی ہوں گھُٹتا ہے مرا دم

گھمسان کرنا۔

جس صف میں چمک کر گری گھمسان کر آئی — جمعیت اعدا کو پریشان کر آئی

ڈر بمعنی غالب

طینت میں وفا رُخ پہ شجاعت کے اثر تھے — گنتی میں بہتّر تھے مگر لاکھ پہ ڈر تھے

شمشیر کرنا ۔ تلوار چلانا

میں مواجاتا ہوں للہ شمشیر کرد ۔ بخشوانے کی گنہگاروں کی تدبیر کرد

بتر بھر = تتر بتر ہونا۔

تر بھر تمام ہو گئی وہ شام کی سپاہ ۔ پہنچا پچھاڑ میں پسر ضیغم الٰہ

قرق ۔ بمعنی بندش ۔

پانی کا قرق خاص ہے مجھ دلفگار پر ۔ کھائے گا کیا نہ کوئی ترس شیرخوار پر

کاہے کا = کس لئے ۔

پیاسے ہیں تین دن سے امام فلک وقار ۔ کاہے کا ہے یہ خوف بڑھو بہر کارزار

گلتھم = گل

سب آزمودہ کار قوی تن جواں ہیں ۔ اور گلتھم اُدھر تو بہتر جوان ہیں

کمتی = کم

کمتی تھی بس اسی کی ہماری سپاہ میں ۔ پہلے شہید ہوگا یہی حق کی راہ میں

گھینری = گھنی جگہ۔

واں یہ گگرو ہوں جہاں چھاؤں گھینری ہووے ۔ عمر بھر گر انہیں دیکھیں تو نہ سیری ہووے

نراسا = مایوس

اُس طرف سے وہ پریشان نراسے بھی بڑھے ۔ نیچے تول کے حیدر کے نواسے بھی بڑھے

حق بطرف = سچ ۔

شہ کا تو حق بطرف ہے کہ ہے بھائی ایسا ۔ حُسن سے جس کے منوّر ہو امیدانِ دعا

سجائی = سجاوٹ کی جگہ) ۔ چہرہ کی سجائی سے قبا چُست ہے تن کی ۔

گودی (گود کی جگہ) گودی میں گئی باپ کے گھبرا کے وہ بے آس

کمروں (لبسکون میم) کمروں کو کسو گلشنِ جنّت کے سفر بد

خشکیدہ (سوکھی ہوئی) خشکیدہ زبانوں پہ سخن شکر کا جاری

خصوصیاتِ شاعری

میرانیس نے شاعری ترکہ میں پائی تھی۔ مرثیہ نگاری ان کا ورثہ تھی، خود فرماتے ہیں۔ ؎

عمر گزری ہے اسی دشت کی سیاحی میں

"پانچویں پشت ہے شبّیر کی مدّاحی میں"

شعر و شاعری کے لئے جتنی باتیں ضروری ہیں وہ سب میرانیس میں بدرجۂ اتم موجود تھیں۔ ان کی شاعری مختلف اور متنوّع مضامین کی آئینہ دار ہے۔ انھوں نے اس زمانہ میں آنکھ کھولی جب مشرقی تہذیب کا آفتاب لب بام تھا اور شاہی، وظیفہ خواری سے بدل چکی تھی، بہادرانہ جذبات مردہ ہو چکے تھے، پست ہمتی، عیش پرستی اور رنگ رلیوں نے سب کو مٹا دیا تھا، پدرم سلطاں بود، پر سب فخر کرتے اور پس ماندہ عزّت و آبرو، مال و متاع کو تباہ و برباد کرتے رہتے، ہر بوالہوس حسن پرست بن گیا تھا اور آبروئے شیوۂ اہل نظر خاک میں مل چکی تھی، ایسے ماحول میں وہی شاعر کامیاب ہوتا تھا جو ہوا کا رُخ دیکھ کر چلتا تھا، اور اپنے ماحول کے جذبات کی ترجمانی بہتر طور پر کر سکتا تھا۔ میرانیس نے بھی شروع میں غزلیں کہیں لیکن گھر کے ماحول اور طبیعت کی اُفتاد

خاندان کی سیادت و شرافت اور سب سے بڑھ کر اہل بیت کرام سے محبت و عقیدت، نے انھیں بہت جلد راستہ چلنے پر مجبور کیا، جو سب سے الگ تھلگ تھا اور جس کا دائرہ بہت محدود تھا، اور جس میں بظاہر ترقی اور نام آوری کے امکانات بالکل نہیں تھے، میر ضمیر نے اپنے بعد آنے والوں کے لئے کچھ بھی نہیں چھوڑا تھا، میر انیس کا کمال یہی کیا کم ہے کہ انھوں نے مرثیہ گوئی کو معراج کمال تک پہنچا دیا، اور اس کو اس قدر وسعت دی کہ اُردو شاعری اب تک جن خیالات، موضوعات اور مضامین سے خالی تھی، وہ سب ان سب ان مرثیوں میں آ گئے۔ مرثیے میں مذہبی عقیدت کے ساتھ ساتھ، ہر قسم کے خیالات ادا کرنے کے لیے، اخلاق کے قواعد اور اصول کا پابند ہونا لازمی ہے، اور اخلاقی تعلیم، معاشرتی رسم و رواج، سرفروشی و جاں نثاری کا جذبہ، محبت و ہمدردی، عقیدت و اخلاص، رزم و بزم کے ہنگامے، جنگ کے معرکے اور نقشے، لڑنے والوں کی دلیرانہ گفتگو، رجز خوانی، اور دوسرے بے شمار موضوعات مرثیوں میں بیان کئے گئے اور سب ضابطۂ اخلاق کی پابندی کے ساتھ ظاہر ہے ان سب خیالات و جذبات کو ایک ماہر فن کار ہی ادا کر سکتا ہے، میر انیس کا کلام پڑھنے کے بعد انھیں مرثیہ گوئی میں مسلمہ طور پر سب سے افضل و برتر ماننا پڑتا ہے، وہ ایک ماہر فن کار اور قادر الکلام شاعر تھے۔ مولانا حالی کی یہ رائے حرف بحرف صحیح ہے۔

"میر انیس اردو شعراء میں سب سے زیادہ برتر تھے"

مولانا محمد حسین آزاد نے بھی میر انیس کی صفائی کلام، لطف زبان، چاشنی محاورہ، خوبی بندش، حسن اسلوب، مناسبت مقام، طرز ادا اور سلسلہ کی ترتیب میں لاجواب

لکھا ہے۔

میر انیس کے مرثیوں نے اُردو شاعری کی ایک بہت بڑی کمی کو پورا کیا یعنی اُردو شاعری میں دوسری زبانوں کی مشہور نظموں کی طرح ایک بھی رزمیہ نظم نہیں تھی۔ دنیا کی جن عظیم الشان نظموں نے اپنے ملک وقوم کے خیالات پر اثر ڈالے اور اخلاق و عادات کی اصلاح کی، ان میں ہومر کی ایلیاڈ، ورجل کی اینیاڈ، ویاس کی مہابھارت، والمیک کی رامائن، فردوسی کا شاہنامہ، شیکسپیر کے ڈرامے، ملٹن کی پیراڈائز لاسٹ قابل ذکر ہیں، لیکن ان سب شہکاروں پر ظاہری اور معنوی دونوں حیثیتوں سے میر انیس کے مرثیوں کو فوقیت حاصل ہے۔ میر انیس نے تقریبًا دو لاکھ اشعار لکھے ان کا بہت سا کلام اب بھی پردۂ خفا میں ہے۔ ان کے مرثیوں کی تحقیق و تلاش جاری ہے اور جناب سیّد مسعود حسن رضوی ادیب انیس پر عرصہ سے کام کر رہے ہیں، جناب مہذّب لکھنوی صدر انجمن محافظ اُردو نے انیس کے کچھ نئے مرثیے، وقار انیس میں دو جلدوں میں شائع کیے ہیں، برخلاف اس کے مذکورہ بالا نظموں میں اشعار کی تعداد پچاس ساٹھ ہزار سے زائد نہیں۔

ہومر کی ایلیڈ میں صرف سولہ ہزار اشعار ہیں۔

ورجل کی اینیاڈ میں دس ہزار اشعار ہیں

والمیکی کی رامائن میں اڑتالیس ہزار اشعار ہیں۔

سب سے زیادہ اشعار فردوسی کے شاہنامے میں یعنی ساٹھ ہزار ہیں۔

لیکن رامائن کو چھوڑ کر ان سب کے ہیرو اتنے پُر عظمت، باوقار اور اوصاف حمیدہ کے حامل نہیں ہیں۔ اور ان کی ذاتی خوبیاں اس درجہ کی نہیں ہیں کہ پڑھنے اور

سننے والوں کے ذہن و دماغ اور قلب کو متاثر کر کے اپنی طرف متوجہ کر لیں۔ لیکن میرانیس کے ہیرو حضرت امام حسینؑ ہیں جو پیغمبر اسلام حضرت محمد مصطفےٰ کے نواسے، حضرت علی کرّم اللہ وجہہ اور حضرت فاطمہؓ کے صاحبزادے ہیں، جن کے فضائل و مرتبت، اخلاق و عادات اعلیٰ و اشرف ہیں، اس روحانی تعلق اور مذہبی عقیدت کے علاوہ، میدانِ کربلا میں اپنے اہلبیت اطہار، چند رفقاء اور اعزّا کے ساتھ، تین دن بھوکے پیاسے رہ کر حق و صداقت کے لئے، آئین اسلام کی حفاظت کے لیے، قیصر و کسریٰ کی رسم وراثت کو ختم کرنے کے لئے، جمہوریت و مساوات، اخوّت و حرّیت کا بول بالا کرنے کے لئے اور سچ تو یہ ہے کہ روح اسلام کو زندہ اور قائم رکھنے کے لئے اپنے کئی سو گنے دشمنوں سے لڑکر، جام شہادت نوش فرماتے ہیں۔ اس معرکۂ حق و باطل میں بظاہر شکست حق کی ہو جاتی ہے لیکن حقیقت میں حضرت امام حسینؑ نے اپنے برگزیدہ و مقدّس خون سے گلشنِ اسلام کی آبیاری کر کے سدا بہار بنا دیا۔ یہ واقعہ ایسا ہے جو نہ صرف مسلمانوں کے قلوب کو متاثر کرتا ہے بلکہ حق کے ہر ایک فدائی کے دل پر اپنی بے مثل و بے مثال قربانی کا اثر ڈالتا ہے! ایسا قدسی صفات ہیرو، اور میرانیس جیسا فصیح و بلیغ مرثیہ گو، اگر پڑھنے اور سننے والوں کے قلب و جگر پاش پاش ہو جاتے ہیں تو حیرت کی کون سی بات ہے؟ اور اگر میرانیس کے کلام کو، دوسری زبانوں کے بہترین کلام پر فوقیت حاصل ہے تو اس میں تعجب کیا ہے؟ میرانیس کا یہ عقیدہ تھا اور انھوں نے اس کو کئی جگہ اعتراف کیا ہے کہ ان کے کلام میں جو زور و اثر، جو حسن و خوبی، جو فصاحت و سلاست ہے وہ سب اسی امام عالی مقام کے نام کی بدولت ہے جس نے اسلام کو زندگی بخشی ہو۔ دو میرانیس

کے کلام کو مقبولیت اور حیات ابدی کیوں نہ عطا فرماتا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ مرثیوں میں حد سے زیادہ مبالغہ سے کام لیا گیا ہے اور ہر واقعہ کو بڑھا چڑھا کر بیان کیا گیا ہے۔

"مراثی پر کیا موقوف ہے۔ دنیا کی ہر رزمیہ شاعری سے مبالغہ آمیز اور دور از قیاس باتوں کا ایک طومار جمع کیا جا سکتا ہے تاہم ان شاہکاروں کی عظمت شمہ برابر کم نہیں ہوتی بلکہ ان کی عظمت اسی چکا چوند کر دینے والی، خون کو آتش سیال بنا دینے والی اور دلوں میں جذبات ہیبت یا رحم و ہمدردی اکسانے والی شاعری میں مضمر ہے۔ بشرطیکہ جو حالت یا سماں شاعر نے دکھایا ہے یا جس جذبے کی مصوری کی ہے اس کی شدت و قوت کا اظہار بلحاظ موقع و محل ہو، اگر ایسا ہے تو رزمیہ شاعری بعید از قیاس ہوتے ہوئے بھی حقیقت سے ہمکنار ہے کیونکہ شاعر آج صداقت کی ترجمانی اور شاعر کے فن کا حسین مرقع ہے۔"[1]

مرثیوں میں رزمیہ شاعری کو جس خوبی کے ساتھ میر انیس نے سمویا ہے وہ انھیں کا حصہ ہے، حالانکہ اس سے پہلے مرثیے، المیہ واقعات پر مبنی ہوتا تھا، اور اس کی غرض صرف رونا رُلانا ہوتی تھی، میر ضمیر نے اس میں اضافہ کیا اور میر انیس نے اس اضافہ میں چار چاند لگائے، اور مرثیہ رزم و بزم کے اعتبار سے تمام نظموں سے بہتر اور وسیع کر دیا، ٹریجڈی کی یکسانیت لوگوں کے دلوں کو اکتا دیتی ہے، لیکن اب تک شاعری میں آسانی کے ساتھ مختلف واقعات اور حالات کا بیان کیا جا سکتا ہے جس سے اس میں رنگا رنگی پیدا ہو جاتی ہے اور پڑھنے والے کی اکتاہٹ نہیں پید ہوتی۔

---

[1] اردو شاعری میں انیس کا درجہ۔ ناظر کاکوروی ۳۶۴ [illegible]

لکھنؤ کے باکمال ادیب جناب نواب مرزا جعفر علی خاں اثر لکھنوی فرماتے ہیں۔

"ٹریجڈی کے برخلاف ایپک شاعری میں نقل کا آلہ بیان ہے لیکن اس میں ڈرامائی شان ہونا چاہیے، اس کو بھی سالم (ENTIRE) ہونا چاہیے، جس کا مطلب یہ ہے کہ ایک آغاز (BEGINNING) ہو، درمیانی کڑیاں (MIDDLE) ہوں اور اختتام (END) ہو اور اس کو بھی سبق آموز (MORAL) یا مصیبت آلود (DISASTROUS) ہونا چاہیے۔"

ٹریجڈی میں جرأت کا عنصر ضروری ہے لیکن ایپک اس سے بھی آگے بڑھتی ہے اور اپنے بعید از قیاس اور ناقابل یقین باتوں کو بھی شامل کر لیتی ہے کیونکہ اس طرح حیرت رونما ہوتی ہے۔ شاعر کو چاہیے کہ ایسے ناممکنات (IMPOSSIBLITIES) کو جو بظاہر قرین قیاس ہیں ان باتوں پر ترجیح دے جو ممکن ہوتے ہوئے بھی مشتبہ یا مستبعد (IMPROBABLE) ہیں۔"

"یہ بھی دھیان رہے کہ جتنی ایپک نظمیں ہیں اور جس قوم سے متعلق ہیں وہ بالعموم وہاں کے دیوتاؤں یا بلند مرتبت سورماؤں کے کارنامے (DEEDS OF HEROES) ہیں اور ان سب میں مافوق الفطرت اور حیرت انگیز عناصر بھی کم و بیش پائے جاتے ہیں نیز ان انسانوں یا اساطیر کو مذہبی اہمیت حاصل ہوتی ہے۔"

ایپک شاعری کے جو خصوصیات بیان کیے گئے۔ میر انیس کی شاعری ان تمام لوازم کو پورا کرتی ہے اس کا ہیرو وہ شخص ہے جس کی عظمت دنیائے اسلام کو تسلیم ہے بلکہ دوسرے مذاہب والے بھی ادب و احترام کرتے ہیں اور اس کی قربانیوں کو وقعت کی نگاہ سے دیکھتے اور سراہتے ہیں۔"

"انیس مورخ نہیں شاعر ہیں۔ حسینؑ کے کردار کے انسان کا خاص حالات میں کیا طرز عمل ہوگا، کیا برتاؤ ہوگا؟ کیا جذبات ہوں گے یا کیا ہونا چاہئے؟ اس کی بے مثل مصوری انیس سے شروع ہوکر انیس پر ختم ہوگئی۔ دوسرے بڑے شاعروں مثلاً ملٹن کی طرح اس کے کلام میں بھی کچھ کمزوریاں ضرور ملیں گی لیکن من حیث المجموع اس کی شاعرانہ عظمت کو ان سے کوئی صدمہ نہیں پہونچتا۔"

غرض رزمیہ شاعری ہو یا المیہ شاعری، واقعہ نگاری ہو، یا جذبات نگاری، منظر کشی ہو یا مصوری، فصاحت ہو یا بلاغت، سادگی و سلاست ہو یا لفظی و معنوی صنعت، میر صاحب کو ہر ایک پر ید طولیٰ حاصل ہے۔ روزمرہ، محاورہ کا برمحل استعمال، الفاظ و تراکیب کی نشست، ان سب میں چار چاند لگاتی ہیں۔ آتش مرحوم نے شاید انیس ہی کے لئے کہا تھا۔

بندشِ الفاظ جڑنے سے نگوں کے کم نہیں
شاعری بھی، کام ہے آتش، مرصع ساز کا

۱۔ واقعہ نگاری میر انیس نے سلاست زبان، صفائی، روزمرہ، اور خوبی بندش کی نعمتیں ورثہ میں پائی تھیں۔ قسام ازل نے میر صاحب کی فطرت میں ایک خاص جوہر ودیعت کیا تھا جو دوسرے تمام شاعروں کے یہاں کمیاب بلکہ نایاب ہے اور اس نعمت کے مناسب اور بجا استعمال نے انیس کو مجلس کمال کا مسند نشیں بنایا۔ اس جوہر کا مختصر نام مصوری یا واقعہ نگاری ہے جس کو لکھنؤ کی زبان میں یوں کہنا چاہیے کہ "حفظ مراتب جیسا ان کے کلام میں ہوتا ہے وہ انھیں کے ساتھ مخصوص ہے"۔

یعنی "موقع ہو جہاں، جس کی عبارت موودے"۔

انگلستان کے ایک فلسفی ادیب کا خیال ہے کہ شاعری فطرت کی پوشیدہ دلچسپیوں کے چہرہ سے نقاب اُٹھا دیتی ہے، اور اس کے اثر سے ہم کو نامعلوم چیزیں انوکھی معلوم ہونے لگتی ہیں۔" میر صاحب میں یہی خوبی ہے وہ جس حالت، یا جس جذبہ کا بیان کرتے ہیں اس کی ہو بہو تصویر کھینچ دیتے ہیں اور بہت سی معمولی اور چھوٹی باتوں کو جنھیں معمولی شاعر نظر انداز کر جاتا ہے یا محسوس بھی نہیں کر پاتا، وہ بڑے غور و فکر اور تعمق کے ساتھ دیکھتے ہیں اور ان کا بیان ایسی سادہ زبان اور مناسب الفاظ میں کرتے ہیں کہ کلام میں ندرت و جدّت پیدا ہو جاتی ہے اور وہ عجیب اور انوکھا معلوم ہونے لگتا ہے۔ یہی کلام ان کا سہل ممتنع کا خطاب پاتا تھا۔

تصویر کشی کا کمال یہ ہے کہ نقشہ اصل کے مطابق ہو لیکن میر صاحب کی کھینچی ہوئی تصویر اصل سے بہتر ہو جاتی ہے۔ مثلاً کسی کہن سال شجاع اور بہادر انسان کو دیکھ کر وہ کیفیت پیدا نہیں ہو سکتی جو اس بند سے ہوتی ہے۔

ابرو جھکے جو پڑتے تھے آنکھوں پہ بار بار ۔۔۔ رومال پھاڑ کر اُنھیں باندھا تھا استوار
آنکھوں سے شیر نر کی جلالت تھی آشکار ۔۔۔ گویا کہ تھی غلاف میں حیدر کی ذوالفقار

ملندی پہ چلے جو چند قدم جھوم جھوم کے
رعشہ و دلرع ہو گیا ہاتھوں کو چوم کے

یہ بند حضرت حبیب ابن مظاہر کی شان میں ہے۔ آپ بہت ضعیف اور بوڑھے ہو گئے تھے اور حضرت امام حسینؑ کے ہمراہ پیدل تھے۔ کبر سنی میں بھنویں تنتی نہیں بلکہ جھک جاتی ہیں۔ جھکی ہوئی بھوؤں کو رومال سے باندھا تا کہ جوانمردی کی آن باقی رہے آنکھوں کی کیا عمدہ تشبیہ دی ہے اس کو تشبیہ بالمدح کہتے ہیں۔ امام عالی مقام

کی یہ کرامت بھی بیان کردی کہ ابن مظاہر کا رعشہ ان کی دست بوسی کی وجہ سے غائب ہوگیا۔

علامہ شبلی نے واقعہ نگاری کی دو قسمیں بتائی ہیں ۔

ا۔ واقعہ نگار کسی تاریخی واقعہ کو بے کم و کاست نظم کردے اس کے لئے صرف زبان پر قدرت درکار ہے۔شاعری کی چنداں ضرورت نہیں ۔

۲۔ واقعہ اجمالاً معلوم ہے لیکن واقعہ نگار واقعہ کے تمام جزئیات اور حالات اپنی طبیعت سے پیدا کرتا ہے، وہ واقعہ کی نوعیت دیکھتا ہے اور خیال کرتا ہے کہ اس قسم کے موقع پر فطرت کا اقتضا کیا ہے ؟ ان تمام چیزوں کو وہ موجود فرض کرلیتا ہے اور ان کو ادا کرتا ہے ۔"

اس قسم کی واقعہ نگاری کا کمال یہ ہے کہ جو کچھ بیان کیا جائے بالکل بیان واقعی ہو اور تمام واقعات میں اس قسم کا تناسب، ربط، اور موزونی ہو کہ کسی واقعہ کی نسبت شک کا احتمال بھی نہ آنے پائے ۔اس قسم کی واقعہ نگاری کے لئے صرف قدرت زبان کافی نہیں بلکہ فطرت کا بڑا نکتہ داں ہونا چاہئے ۔"

میر انیس نے واقعہ نگاری میں جو کمال حاصل کیا اس کی خصوصیات حسب ذیل ہیں ۔

ا۔ ہر قسم کے واقعات و معاملات و حالات اس کثرت سے نظم کئے ہیں کہ واقعہ نگاری کی کوئی صنف باقی نہیں رہی جو ان کے کلام میں نہ پائی جاتی ہو ۔

۲۔ میر انیس چونکہ فطرت اور معاشرت انسانی کے بہت بڑے راز داں ہیں اسلئے دقیق سے دقیق اور چھوٹے سے چھوٹا نکتہ بھی ان کی نظر سے بچ نہیں سکتا۔ ایکے متعلق

زبان پر یہ قدرت ہے کہ کہیں ان کو دقت پیش نہیں آتی۔"

میر انیس ایسے نازک معاملات تلاش کرکے لاتے جن کی طرف معمولاً کسی اور کی نظر بھی نہیں پہنچ سکتی اور پھر ان کو اس طرح بیان کرتے کہ ان کا کلام بالکل مقتضائے فطرت کے موافق معلوم ہوتا مثلاً اگر بہت سے آدمی ایک جگہ لاٹھیاں یا علم لیے کھڑے ہوں تو دور سے دیکھنے والے کو ان میں درختوں کے جھنڈ کا شبہہ ہوتا ہے۔

حضرت امام حسینؑ سفر میں ہیں اور کوفہ کی طرف جارہے ہیں کہ راستے میں یزید کی فوج کا ایک دستہ حُر کی قیادت میں آتا ہے اور راستہ روک دیتا ہے۔ اس واقعہ کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

حضرت بھی چلے جاتے تھے افسردہ و دلگیر   جو ایک دلاور نے کہی گھوڑے پہ تکبیر
اس شخص سے فرمانے لگے حضرت شبیر   بتلا سبب اس ذکر کا اے صاحب توقیر
کی عرض قریب آکے شہِ عرش نشیں کے
وہ نخل نظر آتے ہیں کوفہ کی زمیں کے

اوروں نے یہ کی عرض کہ اے دلبر زہرؑا   خرمے کے یہاں نخل تو دیکھے نہیں اصلا
عباس علمدار نے جب غور سے دیکھا   کی عرض شہِ دیں سے کہ فوج آتی ہے مولا
کیا جانیے انبوہ ہے، یا چند نفس ہیں
نوکیں یہ سنانوں کی ہیں یا گوشِ فرس ہیں

حضرت امام حسینؑ کربلا کے میدان میں داخل ہوتے ہیں۔ اور دریائے فرات کے کنارے خیمہ بپا کرنے کے لئے فیصلہ کیا جاتا ہے، اتنے میں دشمن کی فوج آتی ہوئی دکھائی دیتی ہے اور جب وہ قریب آجاتی ہے تو خود لب فرات خیمہ بپا کرنے لگتی ہے،

حضرت عباس کو غصہ آجاتا ہے وہ منع کرتے ہیں، غلیم کی فوج کا سردار یزید کے حکم سے مطلع کرتا ہے کہ ہم کو دریا کے کنارے خیمہ نصب کرنے کا حکم ہوا ہے، ہم یہیں قیام کریں گے آپ دوسری جگہ اپنے خیمے نصب کریں ندیا کے کنارے خیمے نہیں نصب کرنے دیں گے۔ رفقائے امام برہم ہوجاتے ہیں اور ترکی بہ ترکی جواب دے کر زبردستی خیمہ نصب کرلینا چاہتے ہیں مگر امام ہمام صلح پسندگی، سے کام لیتے ہیں اور دشمنوں کو درگزر کرتے ہیں۔ حضرت عباس اور اپنے ساتھیوں کو سمجھا بجھا کر منا لیتے ہیں۔ اس واقعہ کو میر انیس نے جس مرثیہ میں بیان کیا ہے اس میں سے چند بند انتخاب کر کے لکھے جاتے ہیں :-

اترا یہ کہہ کے کشتیٔ امت کا ناخدا   جتنے سوار تھے وہ ہوئے سب پیادہ پا
حضرت نے مسکرا کے یہ ہر ایک سے کہا   دیکھو تو کیا ترائی ہے کیا نہر کیا فضا
اکبر شگفتہ ہو گئے صحرا کو دیکھ کر
عباس جھومنے لگے دریا کو دیکھ کر

حضرت امام حسینؑ کو "کشتیٔ امت کا ناخدا" کہنا کتنا معنی خیز فقرہ ہے، جس طرح طوفان نوح کے وقت حضرت نوح علیہ السلام نے اپنے رفقا، کو کشتی میں سوار کر کے طوفان سے بچایا تھا۔ اسی طرح اس وقت حضرت امام حسین علیہ السلام نے اپنے اہلبیت کرام اور اعزا و رفقا کے ساتھ صراط مستقیم پر قائم رہے۔ باقی قریب قریب سب نے یزید کے ہاتھ پر بیعت کرلی تھی، اور یزید کی فوجوں کا طوفان انھیں حق پرستوں کے خلاف امڈا تھا، جن کے سردار حضرت امام حسینؑ تھے، اس لئے انھیں کشتیٔ امت کا ناخدا کہا گیا۔

بولے یہ اشک بھر کے شہنشاہ سربلند کیوں یہ مقام ہے تمھیں شاید بہت پسند
کی مسکرا کے عرض کہ یا شاہ ارجمند بس یاں تو خود بخود ہوئی جاتی ہے آنکھ بند

شیر اب یہیں رہیں گے عنایت جو رب کی ہے
بس کیا کہوں حضور ترائی غضب کی ہے

روتے ہوئے وہاں سے بڑھے آپ چند گام گویا زمیں کی سیر کو اُترا مہ تمام
انجم کی طرح گرد تھے حیدر کے لالہ فام شکلیں وہ نور کی وہ تجمّل وہ احتشام

زلفیں ہوا میں اُڑتی تھیں تھوں میں ہاتھ تھے
لڑکے بھی بند کھولے ہوئے ساتھ ساتھ تھے

اس بند نے پورا نقشہ آنکھوں کے سامنے کھینچ دیا۔ واقعہ نگاری کا کمال اسی کو کہتے ہیں۔

ٹھہرے کنارِ نہر جوانان ماہ رو دھویا کسی نے رخت کسی نے کیا وضو
گھوڑے جو آئے پیاس بجھانے کنارِ جو بھر لائے اشک آنکھوں میں شبیر نیک خو

کھینچی اک آہِ سرد ترائی کو دیکھ کر
ہاتھوں سے دل پکڑ لیا بھائی کو دیکھ کر

حضرت امام حسینؑ کو واقعہ شہادت کا علم تھا، اور وہ یہ بھی جانتے تھے کہ یہ قیام گاہ قتل گاہِ امام و رفقائے امام ہو جائے گی۔ مستقبل کا یہ حزیں واقعہ انکی نگاہوں کے سامنے آگیا اسی لئے امام عالی مقام نے ترائی کو دیکھ کر آہ سرد کھینچی کہ یہیں سب کا مدفن ہوگا اور بھائی کو دیکھ کر دل پکڑ لیا کہ اسی جگہ ان کی شہادت واقع ہوگی۔

بولے یہ ہاتھ جوڑ کے عباس نامور　　خیمہ کہاں بپا کریں یا شاہِ بحر و بر
ایذا ہے محملوں میں بہت اہلِ بیت پر　　بچے ہیں نازکی میں گلوں سے زیادہ تر
کب سے عماریوں کے ہیں پردے چھٹے ہوئے
گرمی کے مارے دم ہیں سبھوں کے گھٹے ہوئے

کچھ سوچ کر امامِ دو عالم نے یہ کہا　　زینب جہاں کہیں وہیں خیمہ کرو بپا
پیچھے ہٹے یہ سنتے ہی عباسِ باوفا　　جا کر قریبِ محملِ زینب یہ دی صدا
حاضر ہے جاں نثار امامِ غیور کا
برپا کہاں ہو خیمۂ اقدس حضور کا

بولی یہ سن کے دخترِ خاتونِ روزگار　　اس امر میں بھلا مجھے کیا دخل میں نثار
خشکی ہو یا ترائی چمن ہو کہ سبزہ زار　　ہر جا مسافروں کا نگہباں ہے کردگار
مختار کائنات کے تم نورِ عین ہو
اُترو وہاں جہاں مرے بھائی کو چین ہو

آرام کو ترس گئے جب سے چھُٹا ہے گھر　　کن آفتوں سے پانچ مہینے ہوئے بسر
یہ آندھیاں، یہ گرمی کے ایام یہ سفر　　دن بھر چلے ہیں دھوپ میں جاگے ہیں رات بھر
گرمی سے کھیت خشک تھے جنگل اُجاڑ تھا
ایک ایک کوس راہ جبل میں پہاڑ تھا

آج اس زمین پر ہمیں لایا ہے آسماں　　اب دیکھئے دکھاتی ہے تقدیر کیا یہاں
آقا کی خیریت کی دعا مانگو بھائی جاں　　یارب مسافروں کو مبارک ہو یہ مکاں
دشمن بہت ہیں بادشہِ خوش خصال کے
بھائی بہن نثار ذرا دیکھ بھال کے

بھائی سے اس زمیں کی سُنی ہے بہت صفت ۔ ہے وہ امام واقفِ اسرار شش جہت
جو جو مُسن ہیں اُن سے بھی لازم ہے مصلحت ۔ صدقے گئی حبیب سے بھی کر لو مشورت
ساحل پہ دشمنوں میں کسی کا عمل نہ ہو
بھیا مجھے بھی ڈر ہے کہ ردّ و بدل نہ ہو

دست ادب کو جوڑ کے اس شیر نے کہا ۔ تشویش کچھ نہ کیجئے اے بنت مرتضیٰ
ہر چند مصلحت مری کیا اور عقل کیا ۔ لیکن ترائی سے کوئی بہتر نہیں ہے جا
جو مہر فاطمہؑ میں ہے یہ وہ فرات ہے
گرمی میں 'قرب نہر کا' آب حیات ہے

حضرت کے حکم کا مترصد ہے جاں نثار ۔ ارشاد یہ ہوا کہ دیا تم کو اختیار
آیا حضور سبط پیمبر وہ ذی وقار ۔ کی عرض خیمہ نہر پہ کرتا ہے خاکسار
اتریں یہیں یہ مرضیٔ آلِ رسول ہے
بولا وہ بحر فیض کہ اچھا قبول ہے

یہ سُن کے خادموں کو پکارا وہ مہ جبیں ۔ فرّاش آ کے جلد مصفّا کریں زمیں
حاضر ہوں آب پاش محل دیر کا نہیں ۔ یاں ہوگا خیمۂ حرم بادشاہِ دیں
جلد ان کو بھیجو لوگ ہیں جو کاروبار کے
لے آؤ اشتروں سے قناتیں اُتار کے

بولے زہیر قین کہ حاضر ہیں سب غلام ۔ بڑھ کر حبیب بھی ہوئے مصروف اہتمام
کرسی منگا کے بیٹھ گئے اک طرف امام ۔ رتبے میں ہوگئی وہ زمیں عرش احتشام
پرتو فگن تھا نور رسالت مآب کا
سر پر لگا تھا چتر زری آفتاب کا

تھا فکر میں خموش دو عالم کا تاجدار　　کھلوار ہے تھے خیموں کو عباس ذی وقار
ناگہ اٹھا شمال کی جانب سے اک غبار　　رایت سیاہ و سرخ نظر آئے تین چار

مڑ کر کہا حبیب نے کچھ رنگ اور ہے
بولا یہ کوئی شام کے لشکر کا طور ہے

یہ ذکر تھا کہ بن میں سیاہی سی چھا گئی　　ڈنکے کی دشتِ ظلم سے کوسوں صدا گئی
گھوڑوں کے دوڑنے سے زمیں تھرتھرا گئی　　جنگی سپاہ گھاٹ کے نزدیک آ گئی

اک ایک پیل زور تہمتن شکوہ تھا
ابن رکاب سبز قدم سرگروہ تھا

بولے ملازموں سے یہ عباس باوفا　　دریافت تو کرو کہ ارادہ ہے ان کا کیا
آتے ہی سرکشی یہ طریقہ ہے کون سا؟　　کہہ دو کہ اہل بیت کے خیمہ کی ہے یہ جا

لازم رسول زادیوں کا احترام ہے
اتریں الگ کہیں یہ ادب کا مقام ہے

کرسی نشیں ہے لخت دل سید البشر　　آئین خسروی سے یہ واقف نہیں مگر
آتی ہے اڑ کے گھوڑوں کی ٹاپوں سے گرد ادھر　　کیا ہے جو روکتے نہیں باگیں یہ خیرہ سر

بھولے ہوئے ہیں اس پہ ہم خاکسار ہیں
شاید ہوا کے گھوڑوں پہ ظالم سوار ہیں

اس فوج کے رئیس نے بڑھ کر کیا کلام　　حکم امیر ہے یہیں اترے سپاہ شام
چھوڑیں گے ہم اسے کہ جو راحت کا ہے مقام؟　　دریا سے ہٹ کے آپ بپا کیجئے خیام

لشکر کشی ہے بادشہِ کائنات پر
کل مورچے سپاہ کے ہوں گے فرات پر

اس کے بعد رئیس شام اپنے لشکر کی تعداد بتاتا ہے، حضرت عباس اور رفقائے امام علیہ السلام کو غصہ آجاتا ہے اور باہم رجز خوانی شروع ہو جاتی ہے۔ یہ تمام بند رزمیہ شاعری کے تحت ہیں۔ گھاٹ پہ تلوار چلنے کی خبر جب حضرت زینب کو ہوئی تو۔

چلائی رو کے زینبِ ناشاد و نامراد
ہے ہے خبر تو لو کہ یہ کس سے ہوا فساد
غربت زدوں سے کیا سببِ کینہ و فساد
دیکھے کوئی کدھر ہیں شہنشاہ خوش نہاد
ہمشیر کو نثارِ امامِ اُمم کرو
لوگو دعائیں اکبر مہ رو پہ دم کرو

محمل سے منہ نکال کے فضّہ نے یہ کہا
بلوہ کنار نہر ہے اے جنتِ مرتضیٰ
نیزے بڑھا بڑھا کے ہٹاتے ہیں اشقیا
قبضہ پہ ہاتھ رکھے ہیں عباسِ باوفا
کیا جانے کس نے ٹوک دیا ہے دلیر کو
سب دشت گونجتا ہے یہ غصہ ہے شیر کو

زینب پکاریں پیٹ کے زانو بصد ملال
ہے ہے غضب ہوا اگر آیا انھیں جلال
کہہ دے کوئی کہ اے اسدِ کبریا کے لال
غربت پہ ابنِ فاطمہؑ کی تم کرو خیال
قربان ہو گئی نہ لڑائی کا نام لو
میں ہاتھ جوڑتی ہوں کہ غصہ کو تھام لو

یہ بات کہہ کے رونے لگی خواہرِ امامؑ
عباس ادھر غضب میں بڑھے سوئے فوج شام
کرسی سے جلد اُٹھ کے پکارے شہِ امامؑ
بھیا ہمارے سر کی قسم روک لو حسام
یکساں ہے بر و بحر ہماری نگاہ میں
غیظ و غضب کو دخل نہ دو حق کی راہ میں

Scanned by CamScanner

آؤ تمھیں قسم ہے جنابِ امیر کی　　بگڑو نہ سرکشی پہ سپاہِ شریر کی
ہمراہ بیٹیاں ہیں شہِ قلعہ گیر کی　　سب سے جُدا ہی چاہئے منزل فقیر کی

کیا دشت کم ہے صابر و شاکر کے واسطے
یہ اہتمام ایک مسافر کے واسطے

آقا نے دی جو اپنے سرِ پاک کی قسم　　بس تھرتھرا کے رہ گیا وہ صاحبِ کرم
پُر تھی شکن جبیں پہ نہ ہوتا تھا غیض کم　　چپ ہو گئے قریب جب آئے شہِ اُمم

گردن جُھکا دی تا نہ ادب میں خلل پڑے
قطرے لہو کے آنکھ سے لیکن نکل پڑے

تیغ و سپر کو پھینک کے بولا وہ نامور　　کہتے بجے ان سے کاٹ کے لیجائیں میرا سر
حکمِ خدا ہے حکم شہنشاہ بحر و بر　　اب کچھ کہوں زباں سے کیا تاب کیا جگر

میں ہوں غلام آپ کے ادنیٰ غلام کا
آقا مجھے خیال تھا بابا کے نام کا

گردن میں ہاتھ ڈال کے آقا نے یہ کہا　　کیوں کانپتے ہو غیظ سے بھائی یہ کیا کیا
لو اب اُٹھا لو تیغ و سپر تم پہ میں فدا　　دریا کو تم تو لے چکے اے میرے مہ لقا

وہ شیر ہو کہ دھاک ہے ساری خدائی میں
دیکھو کوئی تمھارے سوا ہے ترائی میں

ہنستی ہوئی آنکھ کی تعریف سب شعراء نے کی ہے لیکن روتی ہوئی آنکھ کی تصویر کھینچنا میر صاحب کا حصہ تھا۔

روتے ہیں فرقتِ شہِ عالیجناب میں　　نرگس کے پھول تیر رہے ہیں گلاب میں

یہی نرگس کے پھول ایک اور موقع پر قیامت برپا کر دیتے ہیں: حضرت قاسم اپنی ایک شب کی بیاہی دلہن سے رخصت ہوتے ہیں اور ان کو رونے سے منع کرتے ہیں ۔

آنکھوں میں ہتیلیاں رقت کا ہے وفور　　نرگس کے پھول ہاتھوں سے ملنا یہ کیا ضرور

اسی مرثیہ میں جب حضرت قاسم کو دلھن سے بات چیت کرنے میں دیر لگتی ہے اور میدان سے مبارز طلبی کی صدا آتی ہے' حضرت قاسم کی ماں ایک انوکھے طرز سے اپنے صاجزادے کو میدان میں جانے کی تاکید کرتی ہیں ۔

ماں نے کیا اشارہ کہ لے میرے گلعذار　　موقع نہیں ہے دیر کا اٹھو یہ ماں نثار

کیا جانے ہوگا قبر میں کیا حال باپ کا

جی لگ گیا عروس کی باتوں میں آپ کا

جب حضرت شہربانو اپنی بیٹی سے رخصت ہونے لگی ہیں تو اصغر کی طرف سے جو صرف چھ مہینے کے تھے رخصت کے معمولات ادا کرتے ہیں اس موقع پر اکثر مستورات کا دستور ہے کہ بچے کا ہاتھ اس کی پیشانی پر رکھ کر کہتی ہیں کہ دیکھو یہ تمھیں سلام کرتے ہیں اس حالت کو بعینہ ادا کیا ہے۔

بانو نے کہا دست پسر ماتھے پہ رکھ کر　　لو آخری تسلیم بجا لاتے ہیں اصغر

حضرت سکینہ قید خانہ میں دربانوں سے جب اپنا حال کہنے لگتی ہیں اس موقع کا حال لکھا ہے ۔

بولا نہ جب کوئی تو ہوا غم زیادہ تر　　دیوار پکڑے پکڑے گئی وہ قریب در

پٹ کو ہلا ہلا کے پکاری وہ نوحہ گر　　دربانوں جاگتے ہو کہ سوتے ہو بے خبر

بیکس ہوں تشنہ لب ہوں فلک کی ستائی ہوں

کچھ تم سے اپنا حال میں کہنے کو آئی ہوں

حضرت زین العابدین طوق وزنجیر میں گرفتار کربلا سے روانہ ہوتے ہیں۔ ان کی تصویر بڑے دردناک الفاظ میں کھینچی ہے۔

تلواریں لئے چار طرف ظلم کے بانی ‫ ‬ حلقے میں دل آزاروں کے وہ یوسف ثانی

غربت۔ الم بے پدری تشنہ دہانی ‫ ‬ وہ طوق کا ننگر وہ سلاسل کی گرانی

مڑ کر کبھی زینب کے رُخِ پاک کو دیکھا
بیڑی کبھی دیکھی، کبھی افلاک کو دیکھا

بھوکے اور پیاسے گھوڑے کو کس نے نہیں دیکھا؟ میر انیس نے حضرت عباس کے پیاسے گھوڑے کی تصویر جن الفاظ میں کھینچی ہے، اس کا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھرنے لگتا ہے۔ حضرت عباس اپنے پیاسے گھوڑے کے ساتھ نہر پر پانی لینے پہنچتے ہیں اور گھوڑے کو پانی پینے سے روکتے ہیں گھوڑے کی پیاس کی شدت کی وجہ سے بیتابی اور حضرت عباس کا روکنا، اس کشمکش اور کشاکش اور گھوڑے کی اضطرابی کیفیت کو کس خوبی سے بیان کیا ہے؟

دو دن سے بے زباں پہ جو تھا آب و دانہ بند ‫ ‬ دریا کو ہنہنا کے لگا دیکھنے سمند

ہر بار کانپتا تھا سمٹتا تھا بند بند ‫ ‬ چمکارتے تھے حضرت عباس ارجمند

تڑپاتا تھا جگر کو جو شور آبشار کا
گردن پھرا کے دیکھتا تھا منہ سوار کا

حضرت علی اکبرؓ نے ماں سے اجازت حاصل کرکے میدان جنگ میں تشریف لیجانے کا قصد کیا ہے لیکن اپنی پھوپھی حضرت زینب سے جنھوں نے حضرت علی اکبرؓ کو بیٹوں کی طرح پالا تھا، اجازت نہیں لی، حضرت امام حسین علیہ السلام نے فرمایا کہ پھوپھی سے بھی،

اجازت لو، اس وقت حضرت زینب فرماتی ہیں، احساس غم، محبت آمیز طنز ملاحظہ ہو۔

زینب نے کہا جس میں رضائے شہِ عالی ۔۔۔ میں نے تو کوئی بات نہیں منہ سے نکالی
کیا غم ہے نہ پوچھا مجھے ماں سے تو رضا لی ۔۔۔ مالک ہیں وہی میں تو ہوں اک چاہنے والی

صدقے گئے فرزند پھوپھی سوگ نشیں ہے
سمجھیں تو مرا حق ہے نہ سمجھیں تو نہیں ہے

پھر بچپن کے زمانہ میں اپنی محبت و خدمت کی یاد دلائی جاتی ہے۔ انداز بیان نے جیتی جاگتی تصویر کھینچ دی ہے۔

بچپن میں یہ کہا ہے کو مری چھاتی پہ سوئے ۔۔۔ کب جاگی میں تا صبح جو یہ چونک کے روئے
کنگھی نہیں کی، گیسوئے مشکیں نہیں دھوئے ۔۔۔ ان کے لئے کب میں نے پسر ہاتھ سے کھوئے

کیوں روتے ہیں یہ کس لئے حضرت کو قلق ہے
حقدار میں کا ہے کو مرا کون سا حق ہے

بالآخر حضرت علی اکبر پھوپھی سے جنگ کی اجازت طلب کرنے جاتے ہیں اور دفع دخل کے طور پر کہتے ہیں کہ باغ جوانی کو کوئی رائگاں نہیں کرتا اگر کوئی پیر گلشن جہان سے چھٹے تو وہ بھی افسوس کی بات ہے۔

لیکن جہاں سے آج گزرنا ہی خوب ہے ۔۔۔ عزت پہ بات آئے تو مرنا ہی خوب ہے

حضرت علی اکبرؑ کو جب ماں نے سر کٹانے کی اجازت دیدی تو حضرت امام حسینؑ نے حضرت شہربانو کے صبر و رضا کی تعریف کی اور فرمایا۔

مٹی سے بچاتے ہیں سدا جس کا تن پاک ۔۔۔ اس گل پہ گرا دیتے ہیں بس سیکڑوں من خاک
[illegible] جسے عریاں نہیں کرتی تہ افلاک ۔۔۔ وہ قبر میں سوتا ہے دھری رہتی ہے پوشاک

غربت میں کوئی پوچھنے والا نہیں ہوتا
شمعیں بھی جلاؤ تو اجالا نہیں ہوتا

حضرت علی اکبرؑ دشمن کی برچھی سے زخمی ہو گئے ہیں اور زخموں کی تاب نہ لاکر گھوڑے سے نیچے گر کر جام شہادت نوش فرماتے ہیں۔ جوان بیٹے کی موت سے حضرت امام حسینؑ کے دل پر کیا گزری ہ، ان کے قلق و صدمہ کی تصویر انیس نے ایسے الفاظ میں کھینچی ہے کہ جواب نہیں ہو سکتا۔

جب برچھی کھا کے کم ہوا اکبر سا نونہال   فرزند فاطمہ کا کہوں کس زباں سے حال
لرزہ تھا جسم پاک میں خورشید کی مثال   چلاتے تھے شہید ہوا، ہائے میرا لال
تھامے ہوئے کلیجے کو گھبرائے پھرتے تھے
اک اک قدم پہ ٹھوکریں کھا کھا کے گرتے تھے

اور ذیل کے بند سے حضرت امام حسینؑ کی 'تصویر غم' آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے، اور پتھر کا کلیجہ بھی پانی ہو جاتا ہے۔

آنکھوں میں اشک لب پہ فغاں اور دل میں درد   ہاتھوں میں رعشہ چہرۂ اقدس کا رنگ زرد
صدمے سے ہاتھ پاؤں کبھی گرم، گاہ سرد   مثل کماں خمیدہ کمر، گیسوؤں پہ گرد
دیکھی جو کوئی لاش تو گھبرا کے گر پڑے
جلدی کبھی چلے، کبھی غش کھا کے گر پڑے

حضرت زینب کے لال، عون اور محمد زخمی ہو کر قریب المرگ ہیں، حضرت علی اکبرؑ ان کی لاش اٹھانے کے لئے جانا چاہتے ہیں حضرت زینب اُن کو روکتی ہیں، لاشیں گھر میں لائی جاتی ہیں، بیوہ ماں اپنے کلیجے کے ٹکڑوں کو خون میں لتھڑا ہوا دیکھ کر بے قابو

ہو جاتی ہیں، دوسروں کو تو ضبط کرنے کی تلقین کرتی ہیں لیکن خود ضبط نہیں کر سکتی ہیں۔

حضرت علی اکبر کو منع کرنا

گھبرا کے در خیمہ سے زینب یہ پکاری — سر ننگے میں نکلوں گی جو تم ہو جاؤ گے واری
اولاد مجھے تم سے زیادہ نہیں پیاری — بتلاؤ تو میں ان کی ہوں عاشق کہ تمہاری

میداں کی طرف قاسم بے پر بھی نہ جائیں
تلواروں میں عباس دلاور بھی نہ جائیں

شہادت عونؑ و محمدؑ

یہ ذکر ابھی تھا کہ ستمگار پکارے — لو شاہ کی ہمشیر کے بیٹے گئے مارے
ٹکڑے کیا معصوموں کو تلوار کے مارے — وہ لوٹتے ہیں خاک پہ دو عرش کے تارے

پامالی کو ان دونوں کے اسوار بڑھیں گے
بچوں کے سر اب کٹ کے سنانوں پہ چڑھیں گے

حضرت زینب یہ خبر سُن کر دوسروں کو تسلی دینے لگیں لیکن خود کو نہ سنبھال سکیں۔

باتیں یہ کہیں سب سے پہ سنبھلا نہ دلِ زار — تڑپا یہ کلیجہ کہ گری خاک پہ اک بار
واں لاشوں پہ روتے ہوئے پہنچے شہ ابرار — مہماں کوئی ساعت کے ملے دو جگر افگار

کس عمر میں ہستی کا چمن چھوڑ رہے تھے
گودی کے پلے خاک پہ دم توڑ رہے تھے

زخموں کی وجہ سے بچوں کی حالت زار

رُخ زرد تھے اور خاک میں آلودہ تھے گیسو — جھک آتے تھے کٹ کٹ کے منہ تک سے دو ابرو
تلواروں سے ٹکڑے تھے وہ بلور سے بازو — مہتاب سی وہ چھاتیاں اور تیر سے پہلو

پھکتا تھا جگر آنکھ نہ کھل سکتی تھی غش سے
ہونٹوں پہ زبانیں نکل آئی تھیں عطش سے

حضرت زینب کی حالت

دیکھا جو لہو بچوں کا چھاتی امنڈ آئی　　نزدیک تھا مر جائے یداللہ کی جائی
پر فاطمہ کے صبر کی شان اس نے دکھائی　　سب سے یہ کہا نیک لگی میری کمائی

بچے مرے قرباں ہوئے احسان خدا کا
اے بی بیو صدقہ ہے یہ شاہِ شہدا کا

شدتِ غم میں شہید بچوں سے جنگ کے لئے ماں کا کہنا

لو نیمچے کاندھوں پہ دھرو اے مرے پیارو　　تلتے ہوئے شبیر کے ہمراہ سدھارو
گو پیاسے ہو دونوں یہ ہمت کو نہ ہارو　　یہ خون میں ڈوبے ہوئے کپڑے نہ اتارو

اٹھ بیٹھو میں صدقے گئی اتنا نہیں سونے
اس طرح تو جاگے ہوئے دولھا نہیں سوتے

سوتا ہے لڑائی کے دن ایسا کوئی غافل　　بچو تمہیں کیا سن کے کہیں گے شہِ عادل
دیکھو تو تڑپتی ہے یہ ماں صورتِ بسمل　　سلجھاؤ یہ زلفیں کہ الجھتا ہے مرا دل

کیا غش میں ہو یہ سونے کا نقشہ نہیں ہوتا
ایسا تو کوئی نیند کا مارا نہیں سوتا

ننھے علی اصغر جب دشمن کے تیر کا نشانہ بن کر اپنے پدر بزرگوار حضرت امام حسینؑ کی گود میں دم توڑنے لگے اس وقت کی حالت ان الفاظ میں بیان کی ہے۔

گرتا بدن میں آتا تھا اس رنگ سے نظر　　پڑتی ہے اوس پھولوں پہ جیسی دمِ سحر
سینہ تھا صاف صورتِ آئینہ جلوہ گر　　گرمی سے ہو گیا تھا شلوکہ عرق میں تر

چھاتی میں دمبدم جو دم اس کا اٹکتا تھا
گھبرا کے ننھے ہاتھوں کو دے دے پٹکتا تھا

اور اس شیر خوار بچّہ کی لاش دفن کرنے لگے تو محبت پدری نے اس طرح قبر سے مخاطب کیا۔

پہلے پہل چھٹا ہے یہ ماں کے کنارے سے ۔۔۔ واقف نہیں ہے گور کی شب ہائے تارے
اے قبر ہوشیار مرے گلعذار سے ۔۔۔ گردن چھدی ہوئی ہے بچانا فشار سے

سید ہے لال حضرت خیر النساء کا ہے
معصوم ہے، شہید ہے، بندہ خدا کا ہے

معصوم علی اصغر کی شہادت کا مرثیہ میر انیس نے بڑے دردناک پیرایہ میں لکھا ہے۔ دشمنوں کی سنگدلی اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتی ہے کہ انھوں نے شیر خوار بچے کو جو شدت پیاس سے تڑپ رہا تھا، پانی دینے کے بجائے، تیر کا نشانہ بنایا اور اپنے نبیؐ کے نواسے کے لخت جگر کو، اسی کی گود میں شہید کر دیا۔ اٹھارہ برس کی کمائی اس سے پہلے لٹ چکی تھی، ابھی اس کی لاش کو دفن کر کے فراغت ہوئی تھی کہ ظلم و ستم کی تیز آندھی نے، خاندان نبوت کی اس شمع کو بھی خاموش کر دیا۔ یہ مرثیہ رنج و غم، اور درد و الم کی مجسم تصویر ہے۔

کربلا کی تپتی ہوئی دھوپ میں، دوپہر کے وقت، حضرت امام حسین علیہ السلام اتمام حجت کی خاطر، ننھے علی اصغر کو گود میں لے کر، ان کے لئے دشمنوں سے پانی مانگنے کے لئے باہر آتے ہیں۔

بچے کو لئے گھر سے جو نکلے شہ والا ۔۔۔ تھی دھوپ میں تیزی کہ ہرن ہوتا تھا کالا
نکلا تھا کبھی گھر سے نہ وہ ہنسلیوں والا ۔۔۔ دامان عبا چہرۂ فرزند پہ ڈالا

روتا تھا تو چھاتی سے لگا لیتے تھے شبیرؑ
ہر گام پہ دامن کی ہوا دیتے تھے شبیرؑ

مرثیہ میں وہ واقعہ بڑا ہی دردناک اور حسرتناک ہے جب حضرت امام حسینؑ علیہ السلام تن تنہا رہ جاتے ہیں۔ بیٹے، بھتیجے، بھائی، عزیز و اقارب، سب جام شہادت پی چکے ہیں، "تشنہ کام معصوم بھی آغوش مبارک میں تیروں کا نشانہ بن کر شہید ہو چکا ہے"، اب صرف تنہا حضرت امام کی ذات بابرکات باقی رہ گئی ہے، اہلبیت اطہار کا اب کوئی والی وارث نہیں رہا۔ حضرت زین العابدین بیماری کی وجہ سے خیمے میں موجود ہیں۔ چاہتے ہیں کہ امام عالی مقام سے پہلے حق کی راہ میں جان دیں، لیکن مرض کی شدت ہلنے تک نہیں دیتی۔ صبر و شکر کا پیکر، حق و صداقت کا مجسمہ، آخری بار سب سے ملنے خیمہ میں تشریف لے جاتا ہے اور سب کو صبر کی تلقین فرما کر میدان جنگ میں جانے کی تیاری کرتے ہیں۔ بہن سے رخصت حاصل کر رہے ہیں۔

دامن پکڑ کے شاہ کا بولی وہ دلفگار اے ابن فاطمہؑ یہ کنیز آپ کے نثار
بعد آپ کے جو لوٹنے آئیں ستم شعار بیٹھیں کہاں یہ بیکس و غمخوار و سوگوار
کچھ حق میں اس کنیز کے فرما کے جائیے
صاحب کسی جگہ مجھے بٹھلا کے جائیے

میں وہ ہوں جو کہ قید میں آئی تھی یا امام مشہور ہوں کنیز امام فلک مقام
پاس آپ کے ہے نانا کا اے قبلۂ انام گر قید ہو گئی تو کہیں گے یہ خاص و عام
بندی چلی ہے شام کو آل رسولؐ کی
دیکھو یہی بہو ہے علیؑ و بتولؑ کی

فرمایا شہ نے حامی و حافظ ہے ذوالجلال　　زہرا کی بیٹیوں کی رہو تم شریک حال
زینب کو دیکھو سر پہ نہ بھائی نہ دونوں لال　　صاحب تمہارے ساتھ ہے عابد سا خوشخصال

بے وارثوں کا وارث و والی الٰہ ہے
دیکھو ڈگے نہ پاؤں کہ مشکل کی راہ ہے

لو الوداع، لاش پہ اب آ کے روئیو　　لیکن نہ خاک اڑا کے چلا کے روئیو
زانو پہ سر کو شرم سے تیوڑا کے روئیو　　قبر رسول پاک پہ ہاں جا کے روئیو

لٹنے میں صبر و شکر تباہی میں چاہئے
رونا بشر کو خوف الٰہی میں چاہئے

مناظر قدرت

میر انیس کی واقعہ نگاری کا کمال اوپر کی مثالوں سے ثابت ہو چکا۔ ایک واقعہ نگار، شاعر کا مطالعہ کافی گہرا اور مشاہدہ بڑا تیز ہوتا ہے اور اسی لئے وہ مناظر قدرت کے سماں کا بیان نہایت خوبی کے ساتھ کر سکتا ہے۔ اُردو شاعری میں میر ضمیر نے سب سے پہلے مناظر قدرت، کا بیان کیا، لیکن ان کے یہاں مضمون بندی، تشبیہ و استعارات کلام کا اصلی جوہر ہیں اور وہ انھیں پر زیادہ غور و فکر کرتے تھے۔ اس لئے مناظر قدرت کی اصلی حالت کو بیان کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ میر انیس نے اس میں بھی کمال حاصل کیا ہے اور نہایت خوبی کے ساتھ ہر منظر کا بیان کیا ہے۔ ان کی اس خوبی کو مخالفین بھی تسلیم کرتے ہیں۔ چنانچہ مصنف المیزان جو کو میر انیس

کے کلام میں کوئی خوبی نظر نہیں آتی، بھی یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہیں کہ
"مناظر قدرت کشی میں میر انیس لاجواب شاعر تھے"۔

کیا لطف جو غیر پردہ کھولے　　جادو وہ جو سر پہ چڑھ کے بولے

میر صاحب کبھی صبح کا سماں کھینچتے ہیں، کبھی رات کی تاریکی بیان کرتے ہیں، کبھی گرمی، لو، دھوپ کی شدت کا بیان ہے۔ کبھی سورج، چاند، ستارے اور آسمان کی دلآویزی کا ذکر، غرض ہر قدرتی منظر کا پورا پورا نقشہ کھینچ دیا ہے۔

صبح کا منظر:-

پھولا شفق سے چرخ پہ جیب لالہ زار صبح　　گلزار شب خزاں ہوئی آئی بہار صبح
کرنے لگا فلک زر انجم نثار صبح　　سرگرم ذکر حق ہوئے طاعت گزار صبح
تھا چرخ اخضری پہ یہ رنگ آفتاب کا
کھلتا ہے جیسے پھول چمن میں گلاب کا

چلنا وہ باد صبح کے جھونکوں کا دمبدم　　مرغانِ باغ کی وہ خوش الحانیاں بہم
وہ آب و تاب نہر وہ موجوں کا پیچ و خم　　سردی ہوا میں پر نہ زیادہ بہت نہ کم
کھا کھا کے اوس اور بھی سبزہ ہرا ہوا
تھا موتیوں سے دامنِ صحرا بھرا ہوا

آمد وہ آفتاب کی وہ صبح کا سماں　　تھا جس کی ضو سے وجد میں طاؤسِ آسماں
ذروں کی روشنی پہ ستاروں کا تھا گماں　　نہر فرات بیچ میں تھی مثلِ کہکشاں
ہر نخل پر ضیائے سرِ کوہ طور تھی
گویا فلک سے بارشِ بارانِ نور تھی

وہ قمریوں کا چار طرف سرو کے ہجوم　　کوکو کا شور نالۂ حق سرّہٗ کی دھوم
سُبْحَانَ رَبِّنَا کی صدا تھی علی العموم　　جاری تھے وہ جو اُن کی عبادت کے تھے رسوم

کچھ گُل فقط نہ کرتے تھے ربِ عُلا کی مدح
ہر خار کو بھی نوکِ زباں تھی خدا کی مدح

چیونٹی بھی ہاتھ اُٹھا کے یہ کہتی تھی بار بار　　اے دانہ کش ضعیفوں کے رازق ترے نثار
یَاحَیُّ یَاقَدِیْرُ کی تھی ہر طرف پکار　　تسبیح تھی کہیں، کہیں تہلیل کردگار

طائر ہوا میں مست، ہرن سبزہ زار میں
جنگل کے شیر گونج رہے تھے کچھار میں

رات کا سماں

جب زلف کو کھولے ہوئے لیلائے شب آئی　　پردیس میں سادات پہ آفت عجب آئی
فریاد کناں روح امیرِ عرب آئی　　غل تھا کہ شبِ قتلِ شہِ تشنہ لب آئی

سادات کو کیا کیا غمِ جاں کاہ دکھائے
رات ایسی مصیبت کی نہ اللہ دکھائے

کاغذ پہ لکھے کیا قلم اس شب کی سیاہی　　ہے چار طرف جس کی سیاہی سے تباہی
مرغان ہوا بر میں تپاں بحر میں ماہی　　تربت سے نکل آئے تھے محبوبِ الٰہی

فریاد کا تھا شور رسولانِ سلف میں
یثرب میں تزلزل تھا اداسی تھی نجف میں

تھی طرفہ شبِ تار کہ تارے بھی تھے مستور　　اک پارہ ہے جس کا شبِ یلدا شبِ دیجور
دوڑے نہ کہیں شبدیزِ نظر تھا۔ نہ یہ مقدور　　ہوتا نہ تھا ثابت کوئی نزدیک ہے یا دور

حضرت پہ وہ اس تین پہر رات میں گزری
تکلیف سکندر پہ جو ظلمات میں گزری

گرمی کا سماں گرمی کی شدت کی وجہ سے دریاؤں، کنوؤں اور جھیلوں کا پانی سوکھ گیا تھا اور خشکی و تری میں کسی کو بھی چین نہیں تھا۔

مخفی تھے شرر شدت گرما سے حجر میں چلتی تھی یہ لو آگ بھڑکتی تھی جگر میں
نہ بحر میں راحت تھی کسی دل کو نہ بر میں جھیلوں میں نہ پانی تھا نہ پتے تھے شجر میں
پایاب سے تھے گرمی سے وہ دریا جو بڑے تھے
سوتیں بھی نہ آتی تھیں کنویں خشک پڑے تھے۔

تھا مہر کی حدت سے حال شہ ابرار ماتھے سے ٹپکتا تھا عرق سرخ تھے رخسار
تحمید میں جنباں تھے لب لعل گہر بار بھر کر نفس سرد یہ فرماتے تھے ہر بار
اک پھول بھی زہرا کے چمن میں نہ ملے گا
کیا ہوگا جو پانی کسی بن میں نہ ملے گا

گرمی سے یہ تھا حضرت عباسؑ کا عالم منہ سرخ تھا اور ہانپتے تھے صورت ضیغم
چہرہ بھی عرق ناک تھا اور طبع بھی برہم فرماتے تھے اشک آنکھوں میں بھر کر شہ عالم
تم شیر ہو راحت تمھیں بھائی نہ ملے گی
جب تک کسی دریا کی ترائی نہ ملے گی

بھرتا تھا دم سرد پریشاں کوئی ہو کے دامن سے ہوا دیتا تھا منہ کو کوئی دھو کے
بچتا تھا کوئی لو سے ردا چہرے پہ رو کے رکھ لیتا تھا سر پہ کوئی رومال بھگو کے
پڑتے تھے جو چھینٹے تو مزا دیتا تھا پانی
جھک کر کوئی چلو ہی سے پی لیتا تھا پانی

اس مرثیہ میں گرمی کی جیتی جاگتی تصویر کس خوبی سے کھینچی ہے۔

وہ لُو وہ آفتاب کی حدت وہ تاب و تب — کالا تھا رنگ دھوپ سے دن کا مثالِ شب
خود نہرِ علقمہ کے بھی سوکھے ہوئے تھے لب — خیمے جو تھے حبابوں کے تپتے تھے سب کے سب
اُڑتی تھی خاک، خشک تھا چشمہ حیات کا
کھولا ہوا تھا دھوپ سے پانی فرات کا

آبِ رواں سے مُنہ نہ اُٹھاتے تھے جانور — جنگل میں چھپتے پھرتے تھے طائر اِدھر اُدھر
مردم تھے سات پردوں کے اندر عرق میں تر — خس خانۂ مژہ سے نکلتی نہ تھی نظر
گر آنکھ سے نکل کے ٹھہر جائے راہ میں
پڑ جائیں لاکھ آبلے پائے نگاہ میں

شیر اُٹھتے تھے نہ دھوپ کے مارے کچھار سے — آہو نہ مُنہ نکالتے تھے سبزہ زار سے
آئینہ مہر کا تھا مکدّر غبار سے — گردوں کو تپ چڑھی تھی زمیں کے بخار سے
گرمی سے مضطرب تھا زمانہ زمین پر
بھُن جاتا تھا جو گرتا تھا دانہ زمین پر

گرداب پر تھا شعلۂ جوالہ کا گماں — انگارے تھے حباب تو پانی شرر فشاں
مُنہ سے نکل پڑی تھی ہر اک موج کی زباں — تہ میں تھے سب نہنگ مگر تھی لبوں پہ جاں
پانی تھا آگ، گرمیِ روزِ حساب تھی
ماہی جو سیخِ موج تک آئی کباب تھی

آئینۂ فلک کو نہ تھی تاب و تب کی تاب — چھپنے کو برق چاہتی تھی دامنِ سحاب
سب سے سوا تھا گرم مزاجوں کو اضطراب — کافور صبح ڈھونڈتا پھرتا تھا آفتاب

بھڑکی تھی آگ گنبدِ چرخِ اثیر میں
بادل چھپے تھے سب کرۂ زمہریر میں

۴۔ منظر

منظر کشی بھی واقعہ نگاری کی ایک قسم ہے۔ اس میں کسی خاص واقعہ یا کسی خاص حالت کی تصویر کھینچی جاتی ہے۔ اُردو شاعری کا دامن منظر کشی سے بالکل خالی تھا، انگریزی شاعری میں اس کی کافی مثالیں موجود ہیں۔ میرانیس نے منظر یا سین کی تصویر کھینچنے میں کمال دکھایا ہے، اور اُردو شاعری کو فارسی اور دوسری زبانوں کی شاعری سے بھی زیادہ بلند کردیا۔

واقعہ نگاری اور منظر میں فرق:۔

واقعہ نگاری ۔ ہر واقعہ کی انفرادی حیثیت سے بیان کیا جائے۔

منظر کشی ۔ متعدد واقعات یا کسی واقعہ کے تمام جزئیات کو مجموعی طور سے بیان کیا جائے۔

یہاں چند مثالیں منظر کشی کی پیش کی جاتی ہیں۔

سفر کی تیاری | حضرت امام حسین علیہ السّلام سفر کی تیاری کررہے ہیں، اس وقت لوگوں کی جو حالت تھی اُس کا نقشہ ملاحظہ ہو۔

آراستہ ہیں بہر سفر، سروِ قباپوش　　عمامے سروں پر ہیں عبائیں ہیں بسر دوش
یارانِ وطن ہوتے ہیں آپس میں ہم آغوش　　حیراں کوئی تصویر کی صورت، کوئی خاموش

سر ملتا ہے رو کر کوئی سرور کے قدم پر
گر پڑتا ہے کوئی علی اکبر کے قدم پر

عباس کا منہ دیکھ کے کہتا ہے کوئی آہ
اب آنکھوں سے چھپ جائے گی تصویر ید اللہ

کہتے ہیں گلے مل کے یہ قاسم کے ہوا خواہ
واللہ دلوں پر ہے عجب صدمۂ جانکاہ

ہم لوگوں سے شبیر میں سختی کون کرے گا
یہ اُنس یہ خُلقِ حسنی کون کرے گا

روتے ہیں وہ جو عون و محمد کے ہیں ہم سِن
کہتے ہیں کہ مکتب میں نہ جی بہلے گا تم بِن

اس داغ سے چین آئے ہمیں یہ نہیں ممکن
گرمی کا مہینہ ہے، سفر کے یہ نہیں دن

تم حضرت شبیر کے سایہ میں پلے ہو
کیوں دھوپ کی تکلیف اُٹھانے کو چلے ہو

ہم جولیوں سے کہتے ہیں وہ دونوں برادر
ہاں بھائیو تم بھی ہمیں یاد آؤ گے اکثر

پالا ہے ہمیں شاہ نے ہم جائیں نہ کیونکر
مامور ہیں جنگل میں تو اپنا ہے وہی گھر

وہ دن ہو کہ ہم حق غلامی سے ادا ہوں
تم بھی یہ دعا مانگو کہ ہم شہ پہ فدا ہوں

رخصت کے لئے لوگ چلے آتے ہیں پیہم
ہر قلب حزیں ہے تو ہر اک چشم ہے پُر نم

ایسا نہیں گھر کوئی کہ جس میں نہیں ماتم
غُل ہے کہ چلا دلبرِ مخدومۂ عالم

خدام کھڑے پیٹتے ہیں قبر نبیؐ کے
روضہ پہ اُداسی ہے رسولِ عربی کے

پردہ کا اہتمام | چلتے وقت حرم محترم کے لئے پردہ کا انتظام کس طرح کیا گیا، اس کا نقشہ ملاحظہ ہو۔

بیت الشرف خاص سے نکلے شہ ابرار — روتے ہوئے ڈیوڑھی پہ گئے عزت اطہار
فرّاشوں کو عباسؑ پکارے یہ بہ تکرار — پردے کی قناتوں سے خبردار خبردار

باہر حرم آتے ہیں رسولِ دوسرا کے
شقہ کوئی جھک جائے نہ جھونکے سے ہوا کے

لڑکا بھی جو کوٹھے پہ چڑھا ہو اُتر جائے — آتا ہو ادھر جو وہ اسی جا پہ ٹھہر جائے
ناقے پہ بھی کوئی نہ برابر سے گزر جائے — دیتے رہو آواز جہاں تک کہ نظر جائے

مریمؑ سے سوا حق نے شرف انکو دئے ہیں
افلاک پہ آنکھوں کو ملک بند کئے ہیں

آپہنچی جو ناقہ کے قریں دخترِ حیدرؑ — خود ہاتھ پکڑنے کو بڑھا سبطِ پیمبرؐ
نفقہ تو سنبھالے ہوئی تھی گوشۂ چادر — تھے پردۂ محمل کو اُٹھائے علی اکبرؑ

فرزند کمر بستہ چپ و راست کھڑے تھے
نعلین اُٹھا لینے کو عباسؑ کھڑے تھے

گرمی کی شدت سے لوگوں کی پریشانی

وہ گرمیوں کے دن وہ پہاڑوں کی راہ سخت — پانی نہ منزلوں نہ کہیں سایۂ درخت
ڈوبے ہوئے پسینوں میں ہیں خادیوں کے رخت — سونلا گئے ہیں رنگ جوانانِ نیک بخت

راکب عبائیں چاندسے چہروں پہ ڈالے ہیں
تونسے ہوئے سمند زبانیں نکالے ہیں

وہ دن ہیں جن دنوں کوئی کرتا نہیں سفر　　صحرا کے جانور بھی نہیں چھوڑتے ہیں گھر
رنجِ مسافرت میں ہیں سلطان بحر و بر　　لب برگ گل سے خشک ہیں چہرہ عرق میں تر
آتی ہے خاک اُڑ کے یمین و یسار سے
گیسوئے مشکبار اٹے ہیں غبار سے

اہلِ حرم ہیں ہودج و محمل میں بے قرار　　معصوم پانی مانگتے ہیں رو کے بار بار
بانو پکارتی ہے کہ اے شاہ نامدار　　گرمی سے جاں بلب ہے مرا طفل شیرخوار
کیونکر یہ دُکھ اُٹھے چھ مہینے کی جان سے
گرمی ہو یا برستی ہے آگ آسمان سے

چلاتی ہے سکینہ کہ اچھے مرے چچا　　محمل میں گھٹ گئی مجھے گودی میں لو ذرا
بابا سے کہدو اب کہیں خیمہ کریں بپا　　ٹھنڈی ہوائیں لے کے چلو تم پہ میں فدا
سایہ کسی جگہ ہے نہ چشمہ نہ آب ہے
تم تو ہوا میں ہو مری حالت خراب ہے

فوجوں کی آمد اور جنگ کی تیاری کا سماں دیکھئے:

ہے شور آمد آمدِ فوجِ فلک سریر　　فوجوں کی ہر طرف سے چلی آتی ہے بھیر
دعوت کے واسطے ہیں منانے لئے شریر　　حضرت کی پیش کش کو کمانیں ہیں اور تیر
پانی پہ چوکیاں ستم آرا بٹھاتے ہیں
دریا کے گھاٹ برچھیوں سے روکے جاتے ہیں

شقے گئے ہیں شام کے حاکم کے جا بجا　　ہر پرگنہ سے ہے طلبِ لشکرِ جفا
آ کر اترتی جاتی ہیں فوجیں جُدا جُدا　　لیتا ہے جائزہ عمر و سعد بے حیا

غل ہے کریں گے قتل جو زہرا کے ماہ کو
انعام میں ملے گا دو ماہہ سپاہ کو

تیغیں سلاح خانے سے نکلی ہیں بے شمار
ہے جابجا درستیِ اسباب کارزار
ہوتے ہیں لیس تیروں کے دستے کئی ہزار
خنجر ہوئے ہیں ذبح کو پیاسوں کے آبدار
نوکیں نکالی جاتی ہیں تیروں کی سان پر
پھل برچھیوں پہ چڑھتے ہیں پرچم نشان پر

نقارۂ وغا پہ لگی چوب یک بہ بیک
اُٹھا غریو کوس کہ ہلنے لگے فلک
شہپور کی صدا سے ہراساں ہوئے ملک
قرنا پھنکی کہ گونج اُٹھا دشت یک بیک
شورِ دہل سے حشر تھا افلاک کے تلے
مُردے بھی ڈر کے چونک پڑے خاک کے تلے

حد سے فزوں تھی کثرتِ افواج نابکار
نیزہ پہ نیزہ تیغ پہ تھی تیغ آبدار
ہر سمت تھی سناں پہ سناں مثلِ خارزار
ہر صف پہ تھی سپر پہ سپر مثلِ لالہ زار
پیکاں بہم تھے جیسے ہوں گُل بے کِھلے ہوئے
گوشوں سے تھے کمانوں کے چلّے ملے ہوئے

اڈی ہوئی تھی فوج پہ فوج اور دَل پہ دَل
تھے برچھیوں کی صورتِ مقراض پھل بہ پھل
خنجر وہ جن کی آب میں ہے تلخیِ اجل
وہ گرز جن کے ڈر سے گرے دیو سر کے بل
دو دو تبر تھے پاس ہر اک خود پسند کے
حلقوں پہ تھے بچھے ہوئے حلقے کمند کے

لڑائی کی تیاری طبل جنگ بج چکا ہے، طبل کی آواز سن کر بہادروں کے دلوں میں جوش و ولولہ پیدا ہو جاتا ہے۔ اس کی حالت میر انیس نے یوں بیان کی ہے۔

یہ ذکر تھا کہ بجنے لگے طبل اس طرف   مشکل کشا کی فوج نے باندھی ادھر بھی صف
تیروں نے رُخ کیا سوے ابنِ شہِ نجف   سینوں کو غازیوں نے ادھر کر دیا ہدف
تھا بسکہ شوق جنگ ہر اک رشک ماہ کو
جوش آگیا وغا کا حسینی سپاہ کو

غصے سے آفتاب ہوئے مہوشوں کے رنگ   فوجوں پہ جا پڑیں یہ دلوں کو ہوئی اُمنگ
تن تن کے برچھیاں جو سنبھالیں برائے جنگ   بے چین ہو گئے فرسِ ابلق و سرنگ
پاسِ ادب سے شاہ کی صف بڑھ کے تھم گئی
پٹری ہر اک سوار کی گھوڑے پہ جم گئی

کس شان کے ساتھ لڑنے جا رہے ہیں، یہ انداز پڑھ کر بزدل بھی شجاع بن جاتا ہے۔

تمتا جوا بڑھا کوئی قبضہ کو چوم کے   بھالا کسی نے رکھ لیا کاندھے پہ جھوم کے
بولا کوئی یہ غول ہیں کیا شام و روم کے   ٹکڑے اڑائیں گے عمر و شمرِ شوم کے
نامرد جو ہیں آنکھ چراتے ہیں مرد سے
دونوں کو پیار کر کے پھریں گے نبرد سے

دولاکھ سے نظر کسی غازی کی لڑ گئی   بل کھا کے زلف رخ پہ کسی کے اکڑ گئی
چتون کسی کی شور دہل سے بگڑ گئی   منہ سرخ ہو گیا شکن ابرو پہ پڑ گئی
نکلا کوئی سمند کو رانوں میں داب کے
غصے سے رہ گیا کوئی ہونٹوں کو چاب کے

بڑھ کر کسی نے تیر ملایا کمان سے نیزہ کوئی ہلانے لگا آن بان سے
نعرہ کسی کا پار ہوا آسمان سے تلوار کھینچ لی کسی صفدر نے میان سے
اک شور تھا کہ تلخ کیا ہے حیات کو
لاشوں سے چل کے پاٹ دو نہرِ فرات کو

سنتے ہی یہ کلام جوانانِ نامور لڑکے الگ کھڑے ہوئے غول اپنا باندھ کر
کہتے تھے نیچے لیئے وہ غیرتِ قمر یارب شکست کو فیوں کو دے اور ہمیں ظفر
سر کٹ نہ پھر دغا میں جو بڑھ کے قدم گڑے
جا کر درِ یزید پہ اپنا علم گڑے

حضرت عباسؑ نہر فرات سے مشک میں پانی بھر کر واپس ہو رہے ہیں۔ دشمن چاروں طرف سے ان پر ٹوٹ پڑتے ہیں تاکہ وہ پانی لے کر نہ جانے پائیں۔ حضرت عباسؑ عجیب کشمکش میں ہیں کہ اپنے کو بچائیں یا مشک کو سنبھالیں۔ اس مضطربانہ کیفیت کی تصویر ہے۔

اک تشنہ کام لاکھوں میں کس کس کو دے جواب شل ہو گیا تھا بازوئے فرزندِ بوتراب
کہتا تھا ہاتھ اُٹھنے کی مجھ میں نہیں ہے تاب لڑنے میں فکر تھی کہ نہ ضائع ہو مشکِ آب
پروا نہ تھی جو بازوؤں پر تیر کھاتے تھے
لیکن سپر سے مشک سکینہ بچاتے تھے

برچھی سے چھد گیا کبھی دل اور جگر کبھی اک تیر سے ادھر کبھی چھپٹے، اُدھر کبھی
چھاتی تلے تھی مشک کبھی دوش پر کبھی سینہ کبھی تھا مشک کے اوپر سپر کبھی
رہوار پر سنبھلتے جب جھوم جھوم کے
روتے تھے بازوؤں کو علمؑ چوم چوم کے

تکتے تھے مسکرا کے سوئے آسماں کبھی ۔ ہونٹوں پہ پھیر لیتے تھے سوکھی زباں کبھی
لگتا تھا تن پہ تیر کبھی اور سناں کبھی ۔ جھکتے تھے خود فرس سے کبھی اور نشاں کبھی
گھوڑے کو جب بڑھاتے تھے رانوں کو داب کے
قدموں سے نکلے جاتے تھے حلقے رکاب کے

چھینٹیں لہو کی اُڑ کے جو پڑتی تھیں مشک پہ ۔ دامن سے پونچھتے تھے علمدار نامور
یہ پاس تھا کہ تیغوں سے ٹکڑے ہو سراسر ۔ شقہ مگر علم کا لہو سے نہ ہوئے تر
اقبال بادشاہ زمین و زمان ہے
دنیا میں ہم رہیں نہ رہیں یہ نشان ہے

گر کر کبھی اُٹھے کبھی رکھا زمیں پہ سر ۔ ابلا کبھی لہو تو سنبھالا کبھی جگر
حسرت سے کی خیام کی جانب کبھی نظر ۔ کروٹ کبھی تڑپ کے ادھر لی کبھی اُدھر
اٹھ بیٹھے جب تو زخموں سے برچھی کے پھل گرے
تیر اور تن میں گڑ گئے جب منہ کے بل گرے

بیکسی اور تنہائی کی حسرتناک تصویر حضرت امام حسینؑ تن تنہا رہ گئے ہیں، اعوان و انصار، بیٹے اور بھتیجے بھائی اور عزیز سب ایک ایک کر کے لڑائی میں شہید ہو گئے۔ دل پر ان سب کے غموں کا داغ ہے اور جام شہادت نوش فرمانے پر یقین۔ ان خیالات کو کس خوبی سے ادا کیا ہے۔

حضرت پہ ادھر ہوتی ہے اعدا کی چڑھائی ۔ تنہا ہیں نہ بیٹا، نہ بھتیجا ہے، نہ بھائی
سیدانیاں دیتی ہیں محمدؐ کی دوہائی ۔ اعدا میں یہ غل ہے کہ کرو فتح لڑائی

ڈوبے ہوئے خوں میں شہدا گرد پڑے ہیں
گھوڑے پہ اکیلے شہ ابرار کھڑے ہیں

بے تابشِ خورسے عرق افشاں رُخ گلفام
لب خشک ہیں پانی کا میسر نہیں اک جام
لُو چلتی ہے خاک اُڑتی ہے، ہے ظہر کا ہنگام
تنہا پہ چلی آتی ہے امڈی سپہ شام
یہ شوق شہادت ہے شہنشاہِ زمن کو
بوچھار ہے تیروں کے بچاتے نہیں تن کو

ہیں آگ میں تیغوں کے کٹ رہے پر نہیں کچھ غم
اُمّت پہ نہ آنچ آئے دعا ہے یہی ہر دم
ہیں گرد بیاباں میں اٹے گیسوئے پُرخم
نیلے ہیں لبِ لعل یہ ہے پیاس کا عالم
بُو آتی ہے دریا سے برادر کے لہو کی
چھینٹیں ہیں قبا پر علی اکبرؑ کے لہو کی

ذکرِ غمِ عباسؑ بھی اصلاً نہیں کرتے
غیرت سے نظر جانبِ دریا نہیں کرتے
خونِ علی اکبرؑ کا بھی دعویٰ نہیں کرتے
اُمّت کے یہ ہیں ظلم پہ شکوا نہیں کرتے
پانی کے بھی طالب نہیں گو تشنہ دہن ہیں
کلمے ہیں نصیحت کے، محبّت کے سخن ہیں

جذبات نگاری

جذبات نگاری میں میر صاحب کو جو کمال حاصل ہے وہ کسی اور شاعر کو نصیب نہ ہو سکا، ہر قسم کے جذبات کا بیان میر صاحب نے ایسی استادی سے کیا ہے کہ دل وجد کرتا ہے۔ خوشی وغم، رنج والم، محبت و ہمدردی، رشک وحسد، بیم ورجا، خوف وغصہ، غرض ہر جذبۂ انسانی کا بیان بڑی خوبی سے کیا ہے۔ ایک اور صفت یہ ہے کہ کہنے والے کی عمر جنس حالت، تعلق ورشتہ وغیرہ کا پوری طرح خیال رکھتے ہیں۔ مثلاً بچوں کے خیالات بچوں ہی کی زبان سے ادا کرتے ہیں، عورتوں مختلف رشتوں کے نازک فرق کو بھی بدرجۂ اتم ملحوظ رکھا ہے۔

حیرت اس بات پر ہے کہ اُردو شاعری میں اس قسم کے جذبات سرے سے مفقود تھے۔ قصیدہ غزل میں جن جذبات کا اظہار کیا جاتا تھا وہ صرف عشق یا عاشقی اور کسی حد تک بوالہوسی تک محدود تھے۔ البتہ مثنوی میں اظہار جذبات میں وسعت ضرور پیدا ہوئی۔ میر حسن نے 'داخلی جذبات' کا اظہار کیا ہے۔ لیکن مرثیوں میں جذبات نگاری میں جو وسعت میر انیس نے دی اس کی مثال اُردو میں کیا دوسری زبانوں میں بھی نہیں ملتی۔

حضرت عباسؑ کی شہادت بیٹے کا آخری وقت دیکھ کر باپ کے دل پر جو گزری اُس کا بیان پڑھ چکے، باپ اور بیٹے کی محبت، بھائی اور بھائی کی محبت میں جو فرق ہوتا ہے اُس کو حضرت عباسؑ کے اس مرثیے میں پڑھیے۔ حضرت امام حسین علیہ السلام اپنے بھائی حضرت عباسؑ کے مرنے کی خبر سن کر میدان جنگ میں جاتے ہیں ۔۔

دریا پہ سر برہنہ شہِ بحر و بر چلے صدمہ یہ تھا کہ ہاتھوں سے تھامے کمر چلے
اکبر سنبھالے باپ کو باچشمِ تر چلے یہ بھی ادھر چلے شہِ والا جدھر چلے
صدمہ ہے ضربِ غم سے دلِ پاش پاش پر
رونے کو بھائی جاتا ہے بھائی کی لاش پر

القصہ لائے باپ کو اکبر ترائی میں زخمی ملا وہ شیر دلاور ترائی میں
پائی جو بوئے خونِ برادر ترائی میں لاشے کے پاس گر پڑے سرور ترائی میں
گذری تھی عمر ہاتھ جسے جوڑتے ہوئے
دیکھا اُسی کو خاک پہ دم توڑتے ہوئے

منہ رکھ کے منہ پہ بھائی کے بھائی نے دی صدا اے شیر! اے دلیر! یہ بیکس ترے فدا
کیوں پتلیاں پھراتے ہو بھائی یہ کیا کیا عباسؑ! میں حسینؑ ہوں دیکھو مجھے ذرا
میرا بھی حلق خشک ہے خنجر کے واسطے
بھائی کو چھوڑے جاتے ہو دم بھر کے واسطے

اس بند میں بھائی کی جُدائی سے کتنے غم آمیز و درد انگیز جذبات اُبھر آئے ہیں ۔

ٹھہرو! عنانِ توسنِ عمرِ رواں نہ لو ساتھی تھکا ہوا ہے رہِ کارواں نہ لو
کروٹ کراہ کر مرے آرامِ جاں نہ لو لگتی ہے چوٹ دل پہ مرے ہچکیاں نہ لو
مرجاؤں گا میں ساتھ اگر چھوٹ جائے گا
بھائی مرا تو رشتۂ جاں ٹوٹ جائے گا

بولے یہ آنکھ کھول کے عباسِ نامدار آقا ہزار جانِ گرامی ترے نثار
یہ موت زندگی ہے زہے فخر و افتخار نکلے جو گُل کے سامنے بلبل کی جانِ زار

دیدار دیکھنے میں نہ آتا تو موت تھی
پروانہ شمع کو جو نہ پاتا تو موت تھی

شہ نے کہا کہ لینے کو آئے ہیں تم کو سب — عباسؑ چھوڑ جاؤ گے اب ہم کو ہے غضب
سرخاک پر پٹک کے یہ بولا وہ جاں بلب — اے جانِ فاطمہ جگرِ سید عرب
کس کس کو روکئے یہ اعدا کے ریلے ہیں
صدمہ بڑا یہی ہے کہ حضرت اکیلے ہیں

یہ کہہ کے چپ ہوئے تھے کہ اٹھا جگر میں درد — رخسار سرخ سرخ جو تھے ہو گئے وہ زرد
لیں کروٹیں تو بھر گئی زخموں میں رن کی گرد — منہ رکھ کے شہ کے پانوں پہ کھینچی اک آہ سرد
دنیا سے انتقال علم دار ہو گیا
سردار فوج بے کس و بے یار ہو گیا

بھائی کے آگے بھائی تڑپ کر جو مر گیا — صدمہ غضب کا سبط نبیؐ پر گزر گیا
خنجر الم کا دل سے جگر تک اتر گیا — چلاتے تھے کہ شیر ہمارا کدھر گیا
لیتے تھے بوسے جھک کے تنِ پاش پاش کے
اٹھ اٹھ کے گرد پھرتے تھے بھائی کی لاش کے

جھک کر پکارتے تھے کہ بھیا صدا سناؤ — سر رکھ لو میرے زانو پہ گردن ذرا اٹھاؤ
زینبؑ تمھیں بلاتی ہیں خیمے کے در پہ جاؤ — کب سے بلک رہی ہے سکینہ کو دیکھ آؤ
باتوں میں پیار کی کہیں تم سے گلا نہ ہو
دریا پہ سو گئے ہو سکینہ خفا نہ ہو

اکبر نے عرض کی کہ چلیں اب شہِ زماں　　روکر امامِ دیں نے کہا جائیں اب کہاں
واں پھر مرے لئے وہی رونا ہے جو یہاں　　اپنا بھی گھر ہے اب وہی بھائی رہے جہاں
اُٹھتے نہ تھے حسینؑ برادر کو چھوڑ کر
رکھا پسر نے پانوں پہ سر ہاتھ جوڑ کر

اکبر علم کو خیمہ کے اندر جھکا کے لائے　　سر اپنا پیٹتے ہوئے گھر میں حسینؑ آئے
چلاتے تھے کہ بھائی کو بھائی کہاں سے پائے　　عاشق نے ساتھ چھوڑ دیا ہائے ہائے ہائے
چھینا اجل نے ہم سے ہمارے دلیر کو
لو بی بیو! ترائی میں رو آئے شیر کو

شوہر کی موت پر بیوی کے جذباتِ غم

زیرِ علَم تھا زوجۂ عباس کا یہ حال　　ماتھا بھرا تھا خاک سے بکھرے ہوئے تھے بال
چلاتی تھی کہ اے اسدِ کبریا کے لال　　میں سر کو پیٹتی ہوں تمھیں کچھ نہیں خیال
جاتا ہے یوں جہاں سے کوئی آنکھ موڑ کے
مسکن کیا ترائی میں لونڈی کو چھوڑ کے

باپ کی موت پر بیٹوں کی گریہ وزاری

پُرخوں علم کے پاس تھے عباسؑ کے پسر　　نکلے کھُلے تھے کرنوں کے تھرّاتے تھے جگر
ماں نے جو طوق اُتارے تھے اور کان کے گُہر　　سہما ہوا تھا ایک تو اک پیٹتا تھا سر
زلفوں پہ گرد تھی تو رخوں پر غبار تھا
چہروں سے دردِ بے پدری آشکار تھا

چھوٹا یہ شہ سے کہتا تھا آنسو بہا بہا بابا ہمارے گھر میں کب آئیں گے اے چچا
آیا عَلَم پر اُن کے نہ آنے کی وجہ کیا چھوٹے سے رو کے تب یہ بڑے بھائی نے کہا
اماں کی مانگ اُجڑ گئی صدمے گزر گئے
بھیا تمھیں خبر نہیں بابا تو مر گئے

دوڑا یہ سُن کے نہر کی جانب وہ بے پدر رو کر پکارے شاہ کہ بیٹا چلے کدھر
ننھے سے ہاتھ جوڑ کے بولا وہ نوحہ گر بابا کی لاش اُٹھانے کو جاتے ہیں نہر پر
میت نہ اُٹھ سکے گی تو خالی نہ آئیں گے
دامن پہ ہم کٹے ہوئے ہاتھوں کو لائیں گے

رزمیہ شاعری

اُردو زبان میں مرثیہ گوئی سے پہلے رزمیہ شاعری کا وجود تک نہ تھا، مرثیہ میں بھی سب سے پہلے میر ضمیرؔ نے رزمیہ کی ابتدا کی، لیکن میر انیسؔ نے اُس کو درجۂ کمال تک پہنچادیا۔ رزمیہ شاعری کا کمال جن جن امور پر منحصر ہے یعنی

لڑائی کی تیاری، معرکہ کا زور شور، تلاطم، ہنگامہ خیزی، ہلچل، شور و غُل، نقاروں کی گرج، طبل جنگ کی آواز، رناپوں کی آواز، ہتھیاروں کی جھنکار، تلواروں کی چمک دمک، نیزوں کی لچک، کمانوں کا کڑکنا، نقیبوں کا گرجنا، بہادروں کا میدان جنگ میں آنا، مبارز طلب ہونا، باہم معرکہ آرائی کرنا، لڑائی کے داؤں پیچ دکھانا، اس کے ساتھ ہی ساتھ اسلحۂ جنگ اور دیگر سامان جنگ کی الگ الگ تصویر کھینچنا، پھر انجام یعنی فتح و شکست

کا بیان کرنا اور یہ سب اس طرح بیان کئے جائیں کہ آنکھوں کے سامنے جنگ کا نقشہ کھنچ جائے، دل میں وہی جذبات بیدار ہوجائیں، جو جنگ میں موجود ہونے سے ہوتے۔ میر انیسؔ کے کلام میں وہ سب خوبیاں موجود ہیں، انھوں نے جنگ کا بیان اس انداز سے کیا ہے کہ سننے والوں کے کلیجے دہل جاتے ہیں، حریفوں کے داؤں پیچ اور فنون جنگ کا نقشہ اس طرح کھینچا ہے کہ آنکھوں کے سامنے لڑتے ہوئے سپاہی، چلتی ہوئی تلواریں، کٹتے ہوئے سر، چلتے ہوئے تیر، ہنہناتے ہوئے گھوڑے، نعرہ لگاتے ہوئے بہادر، چلنے پھرنے لگتے ہیں۔

ان کی شاعری میں رزمیہ (EPIC) کے تمام اوصاف اپنے پورے عروج اور کمال کے ساتھ موجود ہیں، ان کا شوق سپہ گری اور بانک بنوٹ کی مہارت، رزمیہ شاعری میں بہت کچھ معاون و مددگار ثابت ہوتی ہے، ایسا معلوم ہوتاہے کہ ایک تجربہ کار اور ماہر فن سپہ سالار فوج جنگ کے حالات بیان کررہاہے۔

چند اقتباسات پیش کئے جارہے ہیں۔

ہنگامۂ جنگ جنگ کا آغاز کرنے کے لئے نقارہ بجایا جاتاہے۔ نقاروں کی آواز سن کر سپاہیوں کی کیا حالت ہوتی ہے۔

نقارہ وغا پہ لگی چوب یک بہ یک　　اٹھا غریو کوس کہ ہلنے لگا فلک
شیپور کی صدا سے ہراساں ہوے　　قرنا پھنکی کہ گونج اٹھا دشت دور تک
شور دہل سے حشر تھا افلاک کے تلے
مردے بھی ڈر کے چونک پڑے خاک کے تلے

گھوڑوں سے گونجتا تھا وہ سب وادئ نبرد　　گردوں میں مثل شیشۂ ساعت بھری تھی گرد
تھا چرخ چارمیں پہ رُخِ آفتاب زرد　　ڈر تھا گرے زمیں پہ نہ مینائے لاجورد
گرمی ہجوم فوج سے دوچند ہو گئی
خاک اس قدر اُڑی کہ ہوا بند ہو گئی

کانپے طبق زمیں کے، ہلا چرخ لاجورد　　مانند کہربا ہوا مٹی کا رنگ زرد
اُٹھ کر زمیں سے بیٹھ گئی زلزلہ میں گرد　　تیغوں کی آنچ دیکھ کے بھاگی ہوائے سرد
گرمی سے رن کے ہوش اُڑے وحش و طیر کے
شیر اس طرف اُتر گئے دریا کو پیر کے

فوج کی تیاری اور سامان :۔

اُمڈی ہوئی تھی فوج پہ فوج اور دَل پہ دَل　　تھے برچھیوں کے صورت مقراض پھل پہ پھل
خنجر وہ جن کی آب میں تھی تلخیِ اجل　　وہ گرز جن کے ڈر سے گرے دیو منہ کے بل
دو دو تبر تھے پاس ہر اک خود پسند کے
حلقوں پہ تھے بچھے ہوئے حلقے کمند کے

حد سے فزوں ہے کثرت افواج نابکار　　نیزہ پہ نیزہ تیغ پہ ہے تیغ آبدار
ہر سمت ہے سناں پہ سناں مثلِ خار زار　　ہر صف میں ہے سپر پہ سپر مثلِ لالہ زار
پیکاں بہم ہیں جیسے ہوں گُل بے کھِلے ہوئے
گوشوں سے ہیں کمانوں کے گوشے ملے ہوئے

ہر صف میں برچھیاں بھی ہزاروں لچکتی ہیں　　نوکیں وہ تیز ہیں کہ دلوں میں کھٹکتی ہیں
نیزے تلے ہوئے ہیں سنانیں چمکتی ہیں　　ترکش کھلے ہوئے ہیں کمانیں کڑکتی ہیں

سنگیں دلوں نے ہاتھوں میں پتھر اُٹھائے ہیں
تیغوں کے ساتھ گرز گراں سر اُٹھائے ہیں

حضرت قاسم کا مقابلہ

یہ کہہ کے اپنے چھوٹے سے نیزے کو دی تکاں
چمکی انی تو برق پکاری کہ الاماں
اک بند باندھ کر جو فرس سے کہا کہ ہاں
ڈانڈ آئی ڈانڈ پر تو سناں سے لڑی سناں
بل کیا کرے کہ زور ہی موذی کا گھٹ گیا
غل تھا کہ اژدہے سے وہ افعی لپٹ گیا

جھنجھلا کے چوب نیزے کو لایا وہ فرق پر
قاسم نے ڈانڈا ڈانڈ پہ ماری بچا کے سر
دو انگلیوں میں نیزۂ دشمن کو تھام کر
جھٹکا دیا کہ جھک گئی گھوڑے کی بھی کمر
نیزہ بھی دب کے ٹوٹ گیا نابکار کا
دو انگلیوں سے کام لیا ذوالفقار کا

بالائے سر جو ڈانڈ کو لایا وہ خود پسند
کھولے تمام نیزۂ بیداد گر کے بند
پھینکی شقی نے فرق پہ جھنجھلا کے پھر کمند
سر کو بچا کے شیر نے تلوار کی بلند
گردش بھی ہاتھ کی نہ بڑھے کچھ نہ ہٹ گئے
حلقے کھلے تھے جو وہ اشارے میں کٹ گئے

عباسؑ نامدار نے پہلو سے دی صدا
ہاں اب نہ جانے دیجیو احسنت مرحبا
دشمن کے مار ڈالنے کی بس یہی ہے جا
سنتے ہی یہ فرس سے فرس کو کیا جدا
گھوڑا بھی اس طرف کو ادھر ہو کے پھر پڑا
مارا کمر پہ ہات کہ دو ہو کے گر پڑا

حضرت زینب کے صاحبزادگان جناب عون و محمد سے مقابلہ کے لئے دشمن کی طرف سے دو زبردست پہلوان آتے ہیں، کہاں یہ پھول سے نونہال، کہاں وہ قوی ہیکل پہلوان، لیکن شجاعت ہاشمی کسی کو خاطر میں کب لاتی تھی، اب حریفوں کے داؤں پیچ کی تصویر کشی ملاحظہ ہو:۔

بائیں طرف وہ لاتے تھے جب چھیڑ کر سمند — مڑتے تھے داہنی سمت کو دونوں یہ ارجمند
آتے تھے زد پہ سامنے جب وہ جفا پسند — جاتے تھے اُڑ کے یاں سے بھی اسپان سربلند

چوٹیں جو چل رہی تھیں ذرا فرق دین سے
ڈھالوں پہ وار رک رہے تھے جانبین سے

آئے ادھر یہ سن سے وہ زن سے نکل گئے — وہ دب گئے یہ تول کے تیغیں سنبھل گئے
گھوڑے اُٹھا کے جب یہ گئے برمحل گئے — ظالم جہاں پہ تھم گئے سو وار چل گئے

غل تھا کہ اُن کے ہاتھوں کی ضربیں بلا کی ہیں
چوٹیں یہ سب بندھی ہوئی مشکلکشا کی ہیں

پڑتی تھیں ان کے ہاتھوں کی چوٹیں جو بار بار — غصہ میں آکے اور جھپٹتے تھے نابکار
کیں ضربتیں جو مثل ید اللہ نامدار — بچوں سے تیغیں چھٹ کے گریں دو پروں کے پار

بچوں کے ہاتھ دہنے پہ جا کر جو پھر پڑے
سر کٹ کے دونوں خیمہ کی ڈیوڑھی پہ گر پڑے

اسی طرح حسینی سپاہ کے ہر ایک بہادر کے حملے کا زور و شور، چستی و پھرتی، داؤں و پیچ بڑی خوبی سے بیان کیا ہے اور جب شجاعوں کے شجاع، محبوب خدا کے نواسے، شیر خدا کے بیٹے، خیر النساء فاطمہ زہرا کے لال، قدسی صفات قافلہ کے سردار حضرت امام حسین علیہ السلام

میدانِ جنگ میں تشریف لے گئے ہیں اور حق و باطل کی آخری لڑائی ہوئی ہے۔ جب تیغِ حسین غلاف سے نکلی ہے، اور حملۂ حیدری کا نمونہ آنکھوں سے دیکھ کر دشمن سراسیمہ، ہراساں، خوف زدہ اور پریشان ہوگئے ہیں، اُس وقت کی ہو بہو کیفیت میر انیسؔ نے بیان کی ہے۔

نکلی جو رن میں تیغِ حسینی غلاف سے — اُڑنے لگے شرر دمِ خارا شگاف سے
بجلی بڑھی چمک کے جو دشتِ مصاف سے — صاف آئی الاماں کی صدا کوہ قاف سے
طبقے فلک کے صورتِ گہوارہ ہل گئے
دب کر پہاڑ خاک کے دامن سے مل گئے

راحت میں جن و انس و مَلک کے خلل پڑے — قلزم میں ڈر کے مردمِ آبی اُچھل پڑے
کھا کھا کے جوش خاک سے چشمے ابل پڑے — بیر الالم سے غول جنوں کے نکل پڑے
شہ کا غضب نمونۂ قہرِ الٰہ تھا
تلوار کیا علم تھی کہ عالم تباہ تھا

اُٹھا جو الحفیظ کا روحانیوں میں شور — مُردے دہل کے چونک پڑے سب میانِ گور
چلّائے کرگ و شیر و غزالاں و مار و مور — ہے بازوئے حسینؑ میں دستِ خدا کا زور
اُلٹے ہیں مثلِ شیرِ خدا آستین کو
اے کردگارِ عرش بچا لے زمین کو

چلّوں سے کج نہاد ملانے لگے خدنگ — مُنہ ترکشوں نے کھول دئے صورتِ نہنگ
خنجر رکھے کمر میں دو دھارے چٹا کے سنگ — برچھی ہلا کے فوج نے جولاں کئے سرنگ
سرہنگ شام گرز گراں تولنے لگے
بڑھ بڑھ کے بیرقوں کو عدو کھولنے لگے

کالے علم نشان سیہ کالی سب سپاہ گویا زمیں کے سینے سے اُٹھتا تھا دودِ آہ
تھا نالۂ نفیر کہ بے کس کو دو پناہ شہنا کی یہ صدا تھی کہ سید ہے بے گناہ
سُن کر دُہل کا زور کلیجے دہلتے تھے
تھرا کے جھانجھ بھی کفِ افسوس ملتے تھے

وہ غول مصریوں کے وہ دَل شام و روم کے آندھی سیہ اُٹھی کہ گھٹا آئی جھوم کے
تنہا حسین بیچ میں تھا اس ہجوم کے تلوار لی نیام سے قبضہ کو چوم کے
اُٹھا سخی کا ہاتھ یداللہ کی شان سے
نکلا ہمارے اوجِ شرف آسمان سے

باہر ہوئی نیام سے شمشیر شعلہ بار یا ابر سے نکل کے ہوئی برق بے قرار
یا کیچلی کو جھاڑ کے نکلا سیاہ مار یا آستیں سے یدِ بیضا تھا آشکار
نکلی عروسِ فتح محافہ جُدا ہوا
یا نامۂ ظفر سے لفافہ جُدا ہوا

دشمن کی فوج میں ہلچل اور بدحواسی:۔

چلتی تھی ذوالفقار جو سن سن اِدھر اُدھر دہشت سے چھپتے پھرتے تھے دشمن اِدھر اُدھر
کٹ کٹ کے گر رہے تھے سر و تن اِدھر اُدھر ٹکڑے پڑے تھے خاک پہ جوشن اِدھر اُدھر
ڈر کر کے جو سوار کرے وہ مرے گرے
صف پر گری جو صف تو پروں پر پرے گرے

رو ڈیں تنوں کے جسم کے ٹکڑے اُڑا دیے ہاتھوں کے کاٹ کاٹ کے پرزے اُڑا دیے
گردن بھی کسی کی تو شانے اُڑا دیے پہنچا جو سر پہ ہاتھ تو پہنچے اُڑا دیے

اوچھا بھی وار گر کسی دشمن کے لگ گیا
تن چار ہا تڑپ کے الگ، سر الگ گیا

سر سے جُدا تھا خود تو سر تھے جبیں سے دور قبضوں سے قبضیں دور تھیں ہاتھ آستیں سے دور
جاں جسم سے تو جسم تھے جانِ حزیں سے دور کارہ کمیں مکاں سے، مکاں تھے مکیں سے دور
اس تیغ جانستاں سے نقط سر قلم نہ تھے
اللہ رے تفرقہ کہ عناصر بہم نہ تھے

کیا لشکرِ یزید پہ رنج و محن پڑا طالع جو نحس تھے تو اُنھیں پر گہن پڑا
لاشے پہ لاشہ سر پہ سر اور تن پہ تن پڑا کہتی تھی موت بھی کہ قیامت کا رن پڑا
اوپر تلے جو کشتوں کے انبار پاتی تھی
گنتی کو بار بار اجل بھول جاتی تھی

چھوٹیں کمانیں قبضوں سے اور چٹکیوں سے تیر کیسی لڑائی سہمے ہوئے تھے جوان و پیر
غازی تھے تیغ زن قدر انداز گوشہ گیر اپنے لہو میں لوٹتے پھرتے تھے بد شریر
لشکر سیہ رخوں کا جو پامال ہو گیا
مارے خوشی کے تیغ کا منہ لال ہو گیا

رزم کی یہ شان میر انیس کے مرثیوں کے علاوہ کہیں اور نہیں ملے گی۔ میر صاحب نے معرکۂ جنگ کا بیان اس طرح کیا ہے جیسے انھوں نے سب حالات اپنی آنکھوں سے دیکھے ہوں۔ معرکہ آرائی اور فنون جنگ کے نشیب و فراز، خوبی و خرابی سے میر صاحب کو کما حقہٗ واقفیت ہے، اور جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ انھیں بچپن ہی سے ورزش، بنوٹ

وغیرہ کا شوق تھا، کوئی شک نہیں کہ اس فن میں انھوں نے کمال حاصل کیا اور یہی کمال مرثیوں میں معرکہ آرائی کو بدرجۂ اتم بیان کرنے میں کام آیا۔ وہ حریفوں کی لڑائی اس طرح ادا کرتے ہیں گویا فن جنگ کا کوئی بہت بڑا ماہر بیان کر رہا ہے۔

عرب میں دستور یہ تھا کہ لڑائی کی ابتدا رجز سے کی جائے، رجز میں فریقین اپنی اپنی خوبیوں کا بیان کرتے تھے، کہ میں اس خاندان کا ہوں، میری بہادری کا ڈنکا بج رہا ہے، میری دلیری تمام دنیا میں مشہور ہے۔ میری شرافت، میری شجاعت، کا سب کلمہ پڑھتے ہیں اور اس قسم کے فخریہ جملے ہر فریق جنگ شروع کرنے سے پہلے کہتا تھا۔

میرانیس نے حضرت امام حسینؑ کی زبان سے رجز میں ان (رجز) کی فضیلت و شرف کا اظہار کیا ہے۔

میں ہوں سردار شباب چمنِ خلد بریں　　میں ہوں انگشترِ پیغمبر خاتم کا نگیں
میں ہوں خالق کی قسم دوش محمد کا مکیں　　مجھ سے روشن ہے فلک مجھ سے منور ہے زمیں

ابھی نظروں سے نہاں نور جو میرا ہو جائے
محفلِ عالمِ امکاں میں اندھیرا ہو جائے

امام ہمام کی شجاعت اور زور و قوت کو اس طرح بیان کیا ہے۔

بخشا ہے مجھ کو حق نے شہِ لافتیٰ کا زور　　اس دست مرتعش میں ہے دستِ خدا کا زور
ہے انگلیوں کے بند میں خیبر کشا کا زور　　پانی ہے میرے زور کے آگے ہوا کا زور

الٹوں فلک کو یوں جو ہو قصد انقلاب کا
جس طرح ٹوٹ جاتا ہے ساغر حباب کا

آگے بڑھوں جو تیر کو چلّے میں جوڑ کے　　بھاگیں خطا شعار کماں کو چھوڑ کے
بیکار کر دوں شیر کا پنجہ مروڑ کے　　پٹکوں زمین پر درِ خیبر کو توڑ کے

الٹوں طبق زمین کے یوں جھک کے زین سے
جس طرح جھاڑ دیتے ہیں گرد آستین سے

دنیا ہو اک طرف تو لڑائی کو سر کروں　　آئے غضب خدا کا اُدھر رُخ جدھر کروں
بے جبرئیل کار قضا و قدر کروں　　انگلی کے اک اشارے میں شق القمر کروں

طاقت اگر دکھاؤں رسالت مآب کی
رکھ دوں زمیں پہ چیر کے ڈھال آفتاب کی

یہ شجاعت و جوانمردی، یہ قدرت و مقدرت، یہ طاقت و مہارت اگر حضرت علیؓ کے لال، رسول پاک کے نواسے کے حصّہ میں نہ آتی تو پھر کس کے حصّے میں آتی؟ کیونکہ سارے تبرکات جنگ کے تنہا وارث حضرت امامؑ ہی تو تھے۔ دیکھئے کس خوبی سے دشمنوں سے اس وراثت کا بیان کیا جا رہا ہے۔

یہ قبا کس کی ہے بتلاؤ یہ کس کی دستار؟　　یہ زرہ کس کی ہے پہنے ہوں جو میں سینہ فگار؟
بر میں کس کا ہے یہ چار آئینہ جوہر دار؟　　کس کا رہوار ہے یہ آج میں جس پر ہوں سوار؟
کس کا یہ خود ہے، یہ تیغ دو سر کس کی ہے؟
کس جری کی یہ کماں ہے؟ یہ سپر کس کی ہے؟

میرانیس نے یوں تو ہر اسلحہ جنگ کی خوبیاں بیان کی ہیں لیکن گھوڑے اور تلوار کے اوصاف بڑی تفصیل سے بیان کئے ہیں حقیقت یہ ہے کہ اس زمانہ میں جنگ میں گھوڑا اور تلوار ہی سب سے زیادہ ضروری سمجھے جاتے تھے، اور جنگ کی فتح و شکست انھیں دو پر بنی ہوتی تھی اور عرب کے گھوڑے تو میدان کارزار کے لئے خاص مشہور ہیں۔ مرثیہ گویوں نے گھوڑے اور تلوار کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملا دئے ہیں،

اور مبالغہ کی حد کر دی ہے، ان دونوں کی ایک ایک صفت، ایک ایک بات، ایک ایک ادا کی بڑی تفصیل سے تعریف کی ہے۔ تلوار ہے تو اُس کی دھات، اسکی شکل وصورت، اس کی دھار کی تیزی، اُس کی رفتار کی خوبی کا بیان کیا ہے، گھوڑے کے ایک ایک جزو کی تعریف کی گئی ہے، اس کی جسمانی صفات اور ساخت کو دنیا کی حسین ترین چیز سے بہتر ثابت کیا گیا، اس کی تیز رفتاری کے آگے برق بھی ماند ہے، اُس کی آواز سے شیروں کے دل دہل جاتے ہیں۔ ان اشیار کی خوبیاں بیان کرنے میں اس بات کا خاص خیال رکھا گیا ہے کہ وہ کس کی ملکیت میں ہیں۔ اسی اعتبار سے ان کی تعریف کی گئی ہے۔ حضرت عباسؑ کی تلوار اور حضرت امام حسینؑ کی ذوالفقار میں زمین و آسمان کا فرق ہے، اسی طرح حضرت عباسؑ کے گھوڑے اور سید الشہداء کے گھوڑے میں۔

گھوڑے کی تعریف اُردو شاعری میں گھوڑے کی تعریف اور تلوار کی تعریف قصیدوں میں ملتی ہے، قصائد میں ممدوح کے ساتھ ساتھ اس کی شہ سواری، تیراندازی، سیف بازی کی بھی تعریف کی جاتی تھی۔ مرزا محمد رفیع سوداؔ نے گھوڑے کی تعریف کی ہے اور مبالغہ کی حد کر دی ہے۔ گھوڑے کی تیز رفتاری ملاحظہ ہو۔ اُردو شاعری ایسے ہی مبالغوں سے بدنام ہو گئی۔

روبرو سے اگر آئینہ کے اُس گلگوں کو پھینک دے لیکے کبھی شرق سے تو غرب تلک
اتنے عرصے میں پھر آئے تو اُسے باور کر عکس بھی آئنہ سے ہونے نہ پائے منفک

شاعر کی جرأت مبالغہ قابل داد ہے کہ وہ ممدوح کو اس ناقابل یقین اور ناممکن العمل بات کو باور کرنے پر زور بھی دے رہا ہے۔

جب ایک دنیوی اور نام کے رئیسوں، نوابوں کے گھوڑے کی شان میں اس قسم کے مبالغہ آمیز، خلافِ عقل اشعار لکھے جا سکتے تھے، پھر وہ جو مذہبی اور روحانی پیشوا بھی ہے، اُس کے گھوڑے یا تلوار کی تعریف میں مبالغہ یا غلو سے کام لیا گیا تو اس میں حیرت کی کیا بات ہے؟ اس میں کوئی شک نہیں کہ میر انیس کا قلم بھی مدح شمشیر و فرس میں کہیں کہیں بہک گیا ہے، تاہم ان کے کلام کا اصل جوہر ہر جگہ نمایاں ہے۔ گھوڑے کی تعریف میں لکھتے ہیں۔

گھوڑے کی تعریف :۔

خوش رو، و خوش خرام، و خوش اندام، و خوش لجام — خوش خو، و خوش جمال، و ادا فہم و تیز گام
جاندار و شوخ چشم و سعید و خجستہ گام — گل پوش و تیز ہوش و سمن گوش و لالہ فام
غازی تھا، سرفراز تھا، عالی دماغ تھا
گویا ہوا کے دوش پہ اک زندہ باغ تھا

گھوڑے کی لفظی تصویر :۔

وہ تھوتھنی، وہ ابلی ہوئی انکھڑیاں وہ یال — گویا کھلے تھے حور کے گیسو، پری کے بال
وہ جلد، وہ دماغ وہ سینہ وہ سم وہ چال — دم میں کبھی ہما، کبھی ضیغم، کبھی غزال
وہ قصر آسماں پہ بھی جانے میں طاق تھا
دو پر خدا اگر اُسے دیتا بُراق تھا

گھوڑے کے اوصاف :۔

جرأت میں رشک شیر تو ہیکل میں پیل تن — پوئی کے وقت کبک دری، جست میں ہرن
بجلی کسی جگہ تو کہیں ابر قطرہ زن — بن بن کے آنے جانے میں طاؤس کا چلن

سیماب تھا زمیں پہ فلک پر سحاب تھا
دریا پہ موج تھا تو ہوا پر عقاب تھا

غصّے میں انکھڑیوں کے اُبلنے کو دیکھیے — جوبن میں جھوم جھوم کے چلنے کو دیکھیے
سانچے میں جوڑ بند کے ڈھلنے کو دیکھیے — تھم کر کنوتیوں کے بدلنے کو دیکھیے
وہ تھوتھنی کہ غنچۂ سوسن سے تنگ تر
وہ انکھڑیاں خجل ہوں ہرن جن کو دیکھ کر

گھوڑے کی تیز رفتاری۔

وہ شہ سوار اور وہ سمندِ فلک نورد — پائی کبھی صبا نے نہ جس کے قدم کی گرد
بازار برق گرم روانی سے اُس کی سرد — تھا چال میں پری تو چھلاوہ دم نبرد
اس کی سُبک روی سے خجالت سحاب کو
دریا پہ جائے اور نہ خبر ہو حباب کو

صرصر سے تیز تر تھا وہ اسپ خجستہ فر — یکساں تھا اُس کو صورت خورشید دشت و در
پانی پہ تھا جو موج تو آتش میں تھا شرر — گیتی نورد و برق تگ و آسماں سفر
ٹاپوں سے سرکشوں کی صفیں پائمال تھیں
زیں آفتاب تھا تو رکابیں ہلال تھیں

اس تیز رفتاری کی داد دیجیے

مشرق سے جو راکب سے ہاں کہہ کے اُڑائے — عقلِ حکما دنگ ہو سرعت وہ دکھائے
ہ سے الف ہاں ابھی یاں وصل نہ پائے — مغرب سے یہ خورشید فلک جا کے پھر آئے

دھوکا پر پرواز کا ہے دامنِ زیں پر
طاؤس ہوا پر ہے تو بجلی ہے زمیں پر

یہ تا حدِ امکاں صفتِ عقل رسا جائے بالائے فلک صورتِ شبدیز دعا جائے
کہسار سے دریا کی طرف مثلِ ہوا جائے دریا پہ جو دوڑاؤ تو مانند ہوا جائے

سیر اس کی اگر چشم کو منظورِ نظر ہو
آنکھوں میں پھرے یوں کہ نہ پتلی کو خبر ہو

اُڑ جانے میں رنگِ رُخِ عاشق سے سبک تیز کاکل وہ کہ زلفِ سرِ لیلےٰ سے دل آویز
پوئی میں غزالوں کے طراروں سے کہیں تیز آقا کے ارادے کو سمجھتا ہے وہ مہمیز

جوں سایۂ آہو نہ قرار اُس کو کہیں تھا
راکب نے جدھر آنکھ سے دیکھا یہ وہیں تھا

انداز تیزی

سمٹا، جما، اڑا، ادھر آیا، اُدھر گیا چمکا پھرا جمال دکھایا، ٹھہر گیا
تیروں سے اُڑ کے برچھیوں میں بے خطر گیا برہم کیا صفوں کو پرے سے گزر گیا

گھوڑوں کا تن بھی تاپ سے اسکے فگار تھا
ضربت تھی نعل کی کہ سروہی کا وار تھا

آہو کی جست، شیر کی آمد، پری کی چال کبکِ دری خجل، دلِ طاؤس پائمال
سبزہ سبک روی میں قدم کے تلے نہال اک دو قدم میں بھول گئے چوکڑی غزال

جو آگیا قدم کے تلے گرد برد تھا
چھل بل غضب کی تھی کہ چھلاوہ بھی گرد تھا

بجلی کبھی بنا کبھی رہوار بن گیا
آیا عرق تو ابرِ گہر بار بن گیا
گہ قطب، گاہ گنبدِ دوّار بن گیا
نقطہ کبھی بنا کبھی پرکار بن گیا
حیراں تھے اس کے گشت پہ لوگ اس ہجوم کے
تھوڑی سی جا میں پھرتا تھا کیا جھوم جھوم کے

گھوڑے کی آمد اور اُس کی آرائش

آمد فرس کی تھی دُلہن آتی ہے جس طرح
تھم تھم کے نکہتِ چمن آتی ہے جس طرح
خوشبوئے نافۂ ختن آتی ہے جس طرح
یا شمع سوئے انجمن آتی ہے جس طرح
باہم طیور کہتے تھے کبکِ دری ہے یہ
گھوڑے پکار اٹھے کہ بیشک پری ہے یہ
چاروں سموں سے بدر خجل نعل سے ہلال
کھیلیں شکار شیر یہ آنکھیں ہیں وہ غزال
کہئے نہ یال حور نے بکھرا دئے ہیں بال
پھرنے پہ جھوم جھوم کے صدقے پری کی چال
رستے ہیں یاد گنبدِ نیلی رواق کے
دلدل کی تیزیاں ہیں طرارے براق کے
سینہ کشادہ، تنگ کمر، چست جوڑ بند
گردن خمِ ہلال اور اس پر سر بلند
جاندار، دبردبار عدو کش ظفر پسند
بجلی کسی جگہ، کہیں آہو، کہیں پرند
سرعت ہے ابر کی تو لطافت ہوا کی ہے
اتنے ہنر فرس میں یہ قدرت خدا کی ہے
وہ زیب وزین زین کی وہ ساز وہ پھبن
زیور سے جیسے ہوتی ہے آراستہ دُلہن
چشمِ سیاہ دیدۂ آہو پہ طعنہ زن
سُرعت یہ تھی کہ بھولتے تھے چوکڑی ہرن

جادو تھا، معجزہ تھا، پری تھا، طلسم تھا
پاکھر نہ تھی زرہ میں، تہمتن کا جسم تھا

گھوڑے کے غیظ کی تصویر

مانند شیر غیظ میں آیا وہ پیل تن　　آنکھیں اُبل پڑیں صفتِ آہوئے ختن
ماری زمیں پہ ٹاپ کہ لرزا تمام بن　　غل پڑ گیا کہ گھوڑے پہ بھی لوچھا ہے رن
میخیں زمیں کی اس کی تگاپو سے ہل گئیں
دونوں کنوتیاں بھی کھڑی ہو کے مل گئیں

تلوار

تلوار کی تعریف میں مرثیہ گویوں نے اپنے اپنے کمال کے جوہر دکھائے ہیں کہ رزمیہ شاعری کی جان یہی سمجھی جاتی ہے۔ مرزا دبیر نے تو اس میں مبالغہ کی انتہا کر دی، میر انیس بھی، مبالغہ آرائی سے کام لیتے ہیں لیکن ان کا انداز بیان اسے زیادہ معیوب نہیں ہونے دیتا۔ گھوڑے کے قد و قامت، رفتار و کردار، تیزی و چابکدستی، کے نمونے پیش کئے جا چکے ہیں۔ اب تلوار کی کاٹ اور اُس کی تعریف دیکھئے:۔

چمکی، گری، اُٹھی، ادھر آئی ادھر گئی　　خالی کئے پرے تو صفیں خوں میں بھر گئی
کاٹے کبھی قدم، کبھی بالائے سر گئی　　غضب کی تھی کہ چڑھی اور اُتر گئی
غل تھا یہ کیا ہے، آج جو قہرِ صمد نہیں
ایسا تو رود نیل میں بھی جزر و مد نہیں

بجلی گری کہ فوج پہ تیغ دو سر گری کٹ کر کسی کی تیغ، کسی کی سپر گری
چمکی کبھی، فلک پہ، کبھی فرق پر گری سر کاٹ کر ادھر سے جو اٹھی ادھر گری
زرہیں تنوں میں مثل کفن چاک ہو گئیں
اک آن میں صفیں کی صفیں خاک ہو گئیں

اک شور تھا کہ تیغ ہے یہ یا خدا کا قہر بہتی ہے جس کی آگ سے کوسوں کی نہر
ناگن ہے یہ کاٹے کہ جس کی نہیں ہے لہر اتری گلے سے چڑھ گیا سارے بدن میں زہر
زخموں سے جسم اژدرسے کلیجے فگار ہیں
جوہر نہیں ہیں تیغ میں دندان مار ہیں

سر لوٹتے تھے برچھیوں والوں کے ہر طرف ٹکڑے پڑے تھے دشت میں بھالوں کے ہر طرف
پامال تھے سوار رسالوں کے ہر طرف پر کالے اڑتے پھرتے تھے ڈھالوں کے ہر طرف
خاطر نشاں نہ تھی کسی آفت نشان کی
انبار تھی کٹی ہوئیں شاخیں کمان کی

کیا کیا چمک دکھاتی تھی سر کاٹ کاٹ کے ٹھنتی تھی بس تنوں سے زمیں پاٹ پاٹ کے
پانی وہ خود پئے ہوئی تھی گھاٹ گھاٹ کے دم اور بڑھ گیا تھا لہو چاٹ چاٹ کے
کیا جانئے ملا تھا مزہ کیا زبان کو
کھا جاتی تھی ہما کی طرح استخوان کو

پیاسی بھی خوں کی فوج کی اور آبدار بھی غل تھا کہ ایک گھاٹ میں پانی بھی نار بھی
بجلی بھی ابر تر بھی خزاں بھی بہار بھی تلوار بھی چھری بھی سپر بھی کٹار بھی
پانی نے اس کے آگ لگا دی زمانے میں
اک آفتِ جہاں تھی لگا لے بجھانے میں

نیزوں کے بند بند قلم برچھیاں دو نیم — مثل قلم زباں درازو سناں دو نیم
چار آئینہ کٹے ہوئے گرز گراں دو نیم — مغفر سے تا کمر جسدِ پہلواں دو نیم
عالم تھا پیش آئینہ، تیغ جو نہ تھا
لشکر میں کون سا تھا و یکتا جو دو نہ تھا

وہ تیغ جب بڑھی صف کفار ہٹ گئی — چمکی جو برق ڈھالوں کی بدلی سمٹ گئی
دم بھر میں یوں صفوں کو الٹ کر پلٹ گئی — رن کی زمیں لہو کے دریڑوں کٹ گئی
دریا بھی آب تیغ سے بے آبرو ہوا
غل تھا کہ لو فرات کا پانی لہو ہوا

تلوار کا چلنا

سن سن چلی جو تیغ تو جی سن سنا گئے — دریا کے چوکیدار لہو میں نہا گئے
دعویٰ تھا مردمی کا یہ آنکھیں چرا گئے — بچ بچ کے آب تیغ کے چھینٹوں میں آگئے
مٹی نے بھی عزیز نہ ان کا لہو کیا

آفت تھی، قہر تھی، غضب ذوالجلال تھی — بجلی تھی، صاعقہ تھی، فنا تھی، زوال تھی
خنجر تھی، نیمچہ تھی، کٹاری تھی بھال تھی — اعدا کے ذبح کرنے کو سحر ہلال تھی
جیتا تو سامنے سے کوئی کم نکل گیا
منہ اس کا جس نے دیکھ لیا دم نکل گیا

سر اڑ گئے تنوں سے جدھر سرسری چلی — خشکی سے خوں میں ڈوب کے سوئے تری چلی
خالی ہوئے پرے تو غضب میں بھری چلی — غل تھا کہ لو دکھا کے لگاوٹ پری چلی
خنجر انہیں کے ان کا لہو چاٹنے لگے
دیوانے آپ اپنا گلا کاٹنے لگے

چھوٹیں کمانیں قبضوں سے اور چلیوں سے تیر	کیسی لڑائی بھیجے ہوئے تھے جوان دبیر
غازی تھے تیغ زن، قدر انداز گوشہ گیر	اپنے لہو میں لوٹتے پھرتے تھے پھر شریر
لشکر سیہ رخوں کا جو پامال ہو گیا
مارے خوشی کے تیغ کا منہ لال ہوگیا

تلوار کی خوبیاں

قد کتنا خوش نما ہے بدن کسقدر ہے گول	جوہر شناس ہے تو اُسے موتیوں میں تول
مفتاح فتح ہے، درِ نصرت کو اس سے کھول	وہ تیغ ہے خراج صفاہان ہے جس کا مول
اشراف کا بناؤ رئیسوں کی شان ہے
شاہوں کی آبرو ہے، سپاہی کی جان ہے

تلوار کی تعریف میں بند کا آخری شعر لاجواب ہے۔ اس کی مثال اُردو شاعری ہی نہیں بلکہ دوسری زبانوں کی شاعری میں بھی ملنا ناممکن ہے۔ پھر فصاحت وسلاست، روانی و موزونیت کس غضب کی ہے کہ بار بار پڑھنے کو جی چاہتا ہے کہ۔

اشراف کا بناؤ رئیسوں کی شان ہے	شاہوں کی آبرو ہے، سپاہی کی جان ہے

تلوار کی یہ صفت بھی دیکھیے:۔

دل سوز، شعلہ خو، شرر انداز، جاں گداز	لشکر کش وشکست رسان، وظفر نواز
خونخوار و کج ادا و دل آزار و سرفراز	حاضر جواب، تیز طبیعت، زباں دراز
سچ اس کی ہے پسند جہاں، گو سجی نہ ہو،
معشوق پھر نہیں ہے جو اتنی کجی نہ ہو

غزل گو شعراء نے ساقی کی اس کرامت پر بڑا ناز کیا ہے کہ وہ بزم میں جامِ شراب کے

بغیر پاؤں کے چلاتا ہے۔

ہے یہ ساقی کی کرامت کہ نہیں جام کے پاؤں
اور پھر سب لے اسے بزم میں چلتے دیکھا

لیکن میر انیس نے تلوار کو بے پاؤں کے چلا کر نئی بات پیدا کی۔

بے پاؤں جدھر ہاتھ سے چلتی نظر آئی ندی ادھر اک خوں کی اُبلتی نظر آئی
دم بھر میں وہ سو رنگ اُبلتی نظر آئی پی پی کے لہو لعل اگلتی نظر آئی
ہیرا تھا بدن رنگ زمرد سے ہرا تھا
جوہر جو کہو پیٹ جواہر سے بھرا تھا

تیغ کی آمد:۔

آمد تھی تیغ کی کہ اجل کا پیام تھا یہ حرف اخیر تھی وہ رسالہ تمام تھا
بجلی سا ہر جگہ فرسِ تیز گام تھا ششدر تھی، وقت چار طرف قتلِ عام تھا
اس غول پر کبھی تھی، کبھی اس قطار پر
پڑتا تھا ایک تیغ کا سایہ ہزار پر

جب سن سے فوج کفر پہ وہ جنگ جو چلی گویا سموم قہرِ خدا چار سو چلی
بسمل پھڑک کے رہ گئے یوں تند خو چلی ٹکڑے اڑا دیے، ذبح کیا سرخ رو چلی
غل تھا برش ہے قہر کی جوہر بلا کے ہیں
دم بھر میں فیصلہ یہ کرشمے خدا کے ہیں

تیغ کا گلے ملنا:۔

جس کے گلے میں مل کے چلی مر کے رہ گیا بسمل بھی تیغ تیز کا دم بھر کے رہ گیا
آگے بڑھا کوئی تو کوئی ڈر کے رہ گیا سکتے میں کوئی منہ پہ نظر کر کے رہ گیا

دو پتلیاں بھی بہر تماشا تُلی رہیں
سر کٹ کے گر پڑا مگر آنکھیں کُھلی رہیں

تلوار کا خوف

چھپتی تھی برق اُس کی چمک دیکھ دیکھ کے — رہ جاتے تھے سما کو سمک دیکھ دیکھ کے
تھراتا تھا زمیں کو فلک دیکھ دیکھ کے — خورشید کا پتا تھا جھلک دیکھ دیکھ کے
جوہر میں پیچ و تاب تھا زلفوں کے جال کا
بجلی کی زرق برق تھی، چم خم ہلال تھا

تلوار کا دم

دم بھر نہ ٹھہرتی تھی عجب طرح کا دم تھا — نیزے پہ جسے ناز تھا سر اُس کا قلم تھا
ناگن میں نہ یہ زہر نہ افعی میں یہ سم تھا — یہ فتح کی جویا تھی، قد اس واسطے خم تھا
بد اصل تکبر سے سخن کہتے ہیں اکثر
جو صاحبِ جوہر ہیں جھکے رہتے ہیں اکثر

خصوصیاتِ تیغ

پیاسی بھی خون فوج کی اور آبدار بھی — غل تھا کہ ایک گھاٹ میں پانی بھی نار بھی
بجلی بھی ابرِ تر تھی خزاں بھی بہار بھی — تلوار بھی، سپر بھی، چھُری بھی، کٹار بھی
پانی نے اس کے آگ لگا دی زمانے میں
ایک آفتِ جہاں تھی لگانے بجھانے میں

سراپا

مرثیوں میں سراپا لکھنا اور حدود اخلاق و تہذیب کے اندر قائم رکھنا بڑے کمال کی بات ہے۔ یوں تو غزل گو شعراء نے اپنے محبوب کا سراپا لکھا ہے اور اس کے ایک ایک عضو کو مختلف چیزوں سے تشبیہ دی ہے۔ یہ تشبیہات حسن و عشق کی رنگین خیالات و جذبات کے لئے تو مناسب ہیں، لیکن ہمشکل مصطفیٰ، سبط پیمبر، پسر حیدر کے خط و خال کے لئے ان پیش پا افتادہ مضامین سے نقشہ کھینچنا اہلبیت کے ایک عاشق صادق اور عقیدت مند، عجز شاعری سمجھتا ہے، وہ ان کے سراپا کے لئے نئی نئی تشبیہات تلاش کرتا ہے اور اپنی معجز بیانی کا کمال دکھاتا ہے۔ حضرت علی اکبر کے سراپا میں سے چند بند انتخاب کئے جاتے ہیں۔

خالق جسے اپنے یدِ قدرت سے بنائے خورشید کی کیا تاب جو آنکھ اس سے ملائے
یہ چاند سی تصویر کہاں سے کوئی لائے خود ڈھونڈھے نظیر اپنا تو عالم میں نہ پائے
چہرہ گلِ شاداب ہے، قد سروِ سہی ہے
یوسف، شہ والا کے عزیزوں میں یہی ہے

ایک دوسرا سراپا دیکھئے:-

آئینہ جبیں سے صفا آشکار ہے ابرو سے ماہ رُخ سے ضیا آشکار ہے
چشم گہر فشاں سے حیا آشکار ہے رُخ سے جلالِ شیرِ خدا آشکار ہے
رستم بھی چڑھ سکے گا نہ منہ پر دلیر کے
چہرہ تو حور کا ہے یہ تیور ہیں شیر کے

نورِ جبیں سے جلوۂ قدرت دکھادیا چہرے نے حسنِ صبح صباحت دکھادیا
ابرو نے رنگ تیغ شجاعت دکھادیا قامت نے سب کو طورِ قیامت دکھادیا

جنگل کو بوئے کوچۂ گیسو بسا گئی
کپڑوں سے نکہتِ گل فردوس آگئی

اعجاز لب میں چشم میں سحر حلال ہے تِلی نہیں ہے چہرۂ یوسف کا خال ہے
تعریف کیا کروں کہ دہن بے مثال ہے تقسیم جزو لا یتجزیٰ محال ہے

ٹھہرا لیا ہے نقطۂ فرضی دہن نہیں
اسرار کردگار میں جائے سخن نہیں

بے مثل ہے خوشا در دنداں کی آب تاب درِّ عدن کو دیتے ہیں دنداں شکن جواب
یوسف نے دیکھے تھے یہی اختر میاں کے خواب طالع چمک گئے مہ کنعاں ملا خطاب

باتوں میں لب جو ہلتے ہیں اس خوشخصال کے
ہیرے کی چوٹ پڑتی ہے ٹکڑوں پہ لال کے

روشن گر زمانہ ہے صبح گلو کا نور دیکھے اگر تو شرم سے گردن جھکائے حور
نورِ خدا کا صاف گریباں سے ہے ظہور پروانہ شمع حسن پہ جس کے چراغ طور

بوسوں کو حوریں رہ گئی ہیں ہونٹ چاٹ کے
پریوں نے جان دی ہے گلے کاٹ کاٹ کے

طاقت بھی ان کے بازوؤں کا ایک نام ہے زور ان کا خانہ زاد - تہوّر غلام ہے
اقبال ان کے گھر کا مدالمہام ہے ان کے جلو میں فتح و ظفر صبح و شام ہے

ہر دم قشون جاہ و حشم ساتھ رہتے ہیں
نصرت کو ان کی غاشیہ بردار کہتے ہیں

رُباعیات و سلام

رباعیات

اُردو میں رباعیات کا وجود ابتداے شاعری سے ہی ہے۔ سنہ ۱۶۰۰ء سے قبل میر عبدالقادر حیدرآبادی اور ملا وجہی نے رباعیاں لکھیں۔ ملا وجہی ابراہیم قطب شاہ کے زمانہ میں پیدا ہوئے ان کا تعلق محمد قلی قطب شاہ سے تھا' یہ نظم و نثر دونوں میں کمال رکھتے تھے۔ ان کی دو رُباعیاں "اُردو شہ پارے" کے صفحہ ۹۶ پر درج ہیں۔ ان میں سے ایک رباعی یہ ہے۔

خوش حال ہوجیو آج خوشی پاتا نہیں   پیتا ہوں شراب ہور اثر آتا نہیں
کانٹیاں کے ضرب دستے ہیں پھول سب   تج باج سکی باغ مجھے بھاتا نہیں

ملا وجہی کے بعد وَلی دکنی نے جو اُردو شاعری کے باوا آدم اب بھی مانے جاتے ہیں رباعیاں لکھیں۔ یہ اورنگ زیب کے زمانہ میں پیدا ہوئے۔ محمد شاہ کے زمانہ میں شاہ سعد اللہ گلشن کے مرید اور شاگرد ہوئے۔ انھوں نے اپنے کلام کا باقاعدہ دیوان مرتب کیا جس میں غزلیں، رباعیاں، قطعے، مخمس وغیرہ سب شامل ہیں۔ رباعیاں عموماً تغزل اور تصوف کا رنگ لئے ہوئے ہیں، رثائیہ رباعیاں بھی انھوں نے لکھی ہیں۔

کونین حسن حسین کا ممنون ہے   اس یاد سوں عشرت کا سینہ محزوں ہے
الیسوں کے اوپر روا رکھا داغ فلک   جس داغ سوں لالہ کا جگر پرخوں ہے

لیکن ان شعراء نے رباعیات کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں دی، رباعیات کا باقاعدہ آغاز میرؔ اور سوداؔ کے زمانہ سے ہوتا ہے۔ میرؔ تغزل و تصوف کے اور سوداؔ

قصیدہ اور ہجو کے بادشاہ تھے۔ ان کی رباعیوں میں بھی یہی مضامین ملتے ہیں، میر درد، میر حسن، حسرت، جرأت، انشا و رنگین سب نے رباعیاں لکھیں۔ یہ رباعیاں اگرچہ ہر مضمون پر لکھی گئیں لیکن ان کی حیثیت ضمنی سے زیادہ نہیں ہے، غالب، ذوق اور مومن نے بھی اپنے اپنے رنگ میں رباعیاں لکھیں۔

مرثیہ گوئی کی ترقی کے ساتھ رباعیات کا بھی عروج ہوا۔ میر خلیق اور میر ضمیر نے مرثیہ میں اصلاح و اضافہ کی طرف توجہ دی اور اُردو ادب و شاعری میں ایک نئے آفتاب کو طلوع کیا، میر خلیق کا زمانہ مرثیہ کے شباب کا زمانہ تھا، میرزا فصیح، میاں دلگیر مرثیہ ہی میں طبع آزمائی کرتے تھے، ان حضرات کے مرثیہ فصاحت و سلاست محاورات و تخیئل و محاکات، صفائی بندش، و حسن ادا کے بہترین نمونے ہیں۔ مصائب اہلبیت کرام کو بڑے دردناک پیرایہ میں بیان کیا ہے۔ مرثیہ سے پہلے مجلس کو متوجہ کرنے کے لئے پہلے رباعیاں اور سلام پڑھے جاتے تھے، جس سے ہر مرثیہ گو کا رباعی کہنا ضروری سا ہو گیا تھا۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ رُباعیوں کا کافی ذخیرہ ہو گیا۔

میر انیس کے زمانہ میں مرثیہ گوئی اور مرثیہ خوانی کا آفتاب نصف النہار پر تھا، شاہان اودھ کی قدردانی نے اور اہلبیت کرام کے تعلق نے، مرثیہ گوئی کو وہ عروج بخشا کہ اُردو ادب ہی نہیں بلکہ دنیا کی دوسری زبانوں کا ادب بھی اسکی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے۔ میر انیس کے عہد میں سیکڑوں شعراء مرثیہ گو ہو گئے تھے، جنھیں وقتی طور پر کچھ کامیابی ضرور ہوئی لیکن ان کے کلام میں زندہ رہنے کی صلاحیت نہیں اس لئے وہ فنا ہو گیا۔ مرزا دبیر کے کلام میں قریب قریب وہ

تمام خوبیاں موجود تھیں جو انیسؔ کے کلام میں موجود ہیں، اس لئے یہی دونوں مرثیہ گوئی کے آسمان پر آفتاب و ماہتاب بن کر چمکے اور ان کی چمک کے آگے سب کے کلام کی چمک ماند پڑ گئی۔

دوسرے مرثیہ گویوں کی طرح میر انیسؔ مرحوم بھی ہر مرثیہ سے پہلے رباعی پڑھنے کے دستور پر عامل رہے۔ لیکن وہ رباعی کی تصنیف پر کوئی خاص توجہ اور غور و فکر نہیں کرتے تھے۔ عموماً مرثیہ لکھ لینے کے بعد یا مجلس میں جاتے وقت رباعیاں نظم کرتے تھے۔ کبھی کبھی تو مجلس ہی میں فی البدیہہ وحسب موقع رباعی لکھ لیتے تھے۔ میر انیسؔ کی رباعیاں زیادہ تر واقعات کربلا اور حضرت امام حسین علیہ السلام کے اخلاق وفضائل کے متعلق ہیں آسانی کے لئے ان کو تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ مذہبیات۔

۲۔ اخلاقیات۔

۳۔ ذاتیات۔

مذہبی رباعیاں حمد و نعت، منقبت، معتقدات پر مشتمل ہیں۔ حمد کی رباعیوں میں صوفیانہ مذاق کی رباعیاں بھی شامل ہیں، بہت سی ایسی رباعیاں ہیں جو اللہ تعالیٰ کے صفات سے متعلق ہیں۔ نعت میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے فضائل اور منقبت میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور حضرت امام حسین علیہ السلام نیز شہدائے کربلا کے فضائل پر رباعیاں ہیں۔ معتقدات کے تحت جو رباعیاں ہیں وہ زیادہ تر حضرات شیعہ کے اعتقادات پر شامل ہیں۔ لیکن میر انیسؔ کی مضمون آفریں طبیعت نے ان میں ندرت اور تازگی پیدا کر دی ہے، انھوں نے ایک ہی موضوع پر مختلف انداز سے رباعیاں لکھیں اور

ہر رباعی میں نیا اور اچھوتا خیال پیش کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بلا لحاظ مذہب و ملت ان کی ہر رباعی مقبول ہو گئی۔ یہ رُباعیاں زیادہ تر شوق زیارت کربلا و نجف اشرف، فضیلت خاک کربلا، فضائل گریہ، مدح عزادار، مدح چشم عزادار، مدح اشک عزادار اور اسی قسم کے دوسرے مضامین پر مشتمل ہیں۔ مصائب اہلبیت کرام پر میر انیس نے کافی رباعیاں لکھی ہیں۔ ان میں شہادت امیرالمومنین علیہ السلام، امام حسین علیہ السلام کی مدینہ سے روانگی، کربلا میں داخلہ، اہلبیت پر آب و دانہ کی بندش، نیز دیگر مصائب آل رسول کا ذکر کیا گیا ہے۔

۱۔ حمد

حمد باری تعالیٰ :۔

(۱)

جب نزع رواں سے جسم بے قابو ہو — لب پر تیرا ہو ذکر دل میں تو ہو
ہر آدمی میں ہو صدا کہ یا حی و قدیر — ہر سانس میں لا الٰہ الا ہو، ہو

معرفت الٰہی :۔

(۲)

گلشن میں صبا کو جستجو تیری ہے — بلبل کی زباں پہ گفتگو تیری ہے
ہر رنگ میں جلوہ تیری قدرت کا — جس پھول کو سونگھتا ہوں بو تیری ہے

راہِ معرفت :۔

(۳)

سرگرم رہے نہ، سرد آہیں ہیں یہی — سوبا کے حسرت کی نگاہیں ہیں یہی
یہ جسم میں ہیں جو تین سو ساٹھ رگیں — گویا تری معرفت کی راہیں ہیں یہی

رحمت خدا :۔

(۴)

ممکن نہیں عبد سے عبادت تیری — بذل و کرم و عطا ہے عادت تیری
صحرا صحرا ہے گو کہ عصیاں میرے — دریا دریا مگر ہے رحمت تیری

ماں باپ سے سوا ہے شفقت تیری (۵) افزوں ہے ترے غضب سے رحمت تیری
جنّت انعام کر کہ دوزخ میں جلا وہ رحم ترا ہے یہ عدالت تیری

اے خالقِ ذوالفضل و کرم رحمت کر (۶) اے دافعِ ہر رنج و الم رحمت کر
سبقت ہے سزا پہ رحمت کو تری اپنی تجھے رحمت کی قسم رحمت کر

خدا کا اختیار

(۷)

اپنوں کا گنہ نہ غیر ذالک کا ہے کیوں سعی نہ کی قصور سالک کا ہے
تعزیر دے یا عفو کر اے ربِ کریم مملوک پر اختیار مالک کا ہے

خدا کی عطا و بخشش :-

(۸)

توقیر ترے ہی آستانے سے ملی عزّت ترے در پہ سر جُھکانے سے ملی
مال و زر و آبرو دین و ایماں کیا کیا دولت ترے خزانے سے ملی

گوہر کو صدف میں آبرو دیتا ہے (۹) سبزے کو بغیر جستجو دیتا ہے
انسان کو رزق، گل کو بو سنگ کو لعل جو کچھ دیتا ہے جس کو تو دیتا ہے

قدرت خدا

(۱۰)

نہ لعل میں ہے نہ گہر و سنگ میں تو پر صاف چمکتا ہے ہر اک رنگ میں تو
باہر عالم سے ہے بزرگی تیری کس طرح سمایا ہے دل تنگ میں تو

صنعت خدا

(۱۱)

ہر برگ سے قدرتِ احد پیدا ہے ہر پھول سے صنعتِ صمد پیدا ہے
سینہ ہے بشر کا وہ محیط ذخار ہر اک نفس سے جزر و مد پیدا ہے

ب) نعت و منقبت

(۱)

آدم کو یہ تحفہ یہ ہدیہ نہ ملا ایسا تو کسی بشر کو پایہ نہ ملا
اللہ ری لطافت تن پاک رسول ڈھونڈا کیا آفتاب سایہ نہ ملا

اَنَا مَدِیْنَۃُ الْعِلْمِ وَ عَلِیٌّ بَابُھَا

(۲)

کیا بھائیوں کے انس کا اندازہ ہے ہر وقت گلِ عشق تر و تازہ ہے
یہ باب میں حیدرؑ کے نبیؐ کہتے ہیں میں شہر ہوں بازو مرا دروازہ ہے

عقدہ کشائی

(۳)

میزان کرم میں جرم تل جاتے ہیں فردوس میں مثل بوئے گل جاتے ہیں
انگشت علیؑ سے باب خیبر کی طرح عقدے جو ہزاروں ہوں تو کھل جاتے ہیں

سید الشہداء

(۴)

یکتا گہر قلزم سرمد ہے حسینؑ سردار امم مثل محمدؐ ہے حسینؑ
جب سر کو قدم کیا تو سر کی رہ عشق حقا کہ شہیدوں میں سرآمد ہے حسینؑ

(۵)

عباس سا صف شکن نہ ہوگا کوئی اکبر سا بھی گلبدن نہ ہوگا کوئی
گردن پہ لگا تیر مگر لب نہ ہلے اصغر سا بھی کم سخن نہ ہوگا کوئی

رفقائے حسینؑ

اعدا رفقائے شہ سے سر بہ ہوئے لڑتے رہے جب تلک کہ بے سر نہ ہوئے
سرداروں کو آرزو رہی دنیا میں ایسے غازی مگر میسر نہ ہوئے

(ج) اعتقادیہ

خاک شفا

(۱)

زر کے لئے حق نے کیمیا پیدا کی — جو درد دیا اُس کی دوا پیدا کی
عصیاں کے مرض کا جو نہ تھا کوئی علاج — اس کے لئے یہ خاک شفا پیدا کی

مجلس عزا

انس و ملک و حور کی مجلس یہ ہے — تاجِ سرِ جمہور کی مجلس یہ ہے
ہوتی ہے گناہ کی سیاہی زائل — واللہ عجب نور کی مجلس یہ ہے

فضیلتِ ذاکر

بالیدہ ہوں وہ اَوج مجھے آج ملا — ظلِّ علم صاحبِ معراج ملا
منبر پہ نشست سر پہ حضرت کا عَلَم — اب چاہئے کیا تخت ملا تاج ملا

مژگان اشک آلود :۔

ہاں جوشِ غم سرورِ عالی ہو جائے — چہروں پہ ان اشکوں سے بحالی ہو جائے
یوں لختِ جگر چشم سے ٹپکیں پیہم — ہر موئے مژہ پھولوں کی ڈالی ہو جائے

(د) رثائیہ

شہادت حضرت علیؑ

مسجد میں چراغِ دیں خاموش ہوا — ہر سمت فغان و آہ کا جوش ہوا
پہنا ملبوس نیلگوں گردوں نے — کعبہ اسی ماتم پہ سیہ پوش ہوا

شہادت امام حسینؑ

فریاد و فغان و رنج و غم کے دن ہیں — بے شبہہ یہ اندوہ و الم کے دن ہیں
کیونکر نہ کریں لوگ قیامت برپا — بے سر ہوئے شبیر ستم کے دن ہیں

پامالیِ شہداء

جب خاتمہ شاہ خوش اقبال کیا — اعدا نے شہیدوں کا عجب حال کیا
گھوڑے دوڑائے چاند سے سینوں پر — سبزے کی طرح گلوں کو پامال کیا

بربادی خانۂ زہرا

دشمن جو یزید ستم ایجاد ہوا — محبوب خدا کا باغ برباد ہوا
لکھا ہے کہ کربلا میں گھر زہرا کا — ایسا اُجڑا کہ پھر نہ آباد ہوا

۲۔ اخلاقیہ میرانیس صاحب علم وعمل انسان تھے۔ ان کا بلند کردار، اعلیٰ اخلاق، ان کی وضعداری، خودداری، ان کا استغنا و قناعت، ان کی اعلیٰ سیرت و کردار کی گواہی دے رہے ہیں۔ ان کی زندگی کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں وہ تمام صفات اور خوبیاں موجود تھیں جو ایک انسان کو فرشتوں سے بھی زیادہ بلند مرتبہ بنا دیتی ہیں۔ عجز و انکسار، تواضع و خاکساری، فقر و استغنا، قناعت و توکل، صبر و استقامت، غیرت و حمیت، عزت نفس اور خودداری، صاحبان دولت سے بے پروائی، بے ثباتی دنیا، مذمت حرص و آز، یہ اور اسی قسم کی تمام باتوں پر انھوں نے روشنی ڈالی ہے۔ ان کے کلام کی تاثیر کا یہ عالم ہے کہ بیشتر اخلاقی رباعیاں آج زبان زد خاص وعام ہیں۔ ان کے مرثیوں نے دلوں پر مستقل طور پر وہ اثر نہیں ڈالا جو ان رباعیوں نے ڈالا۔ انیسؔ کی پیری کی سحر شام ہو گئی اور آج کوچۂ انیس

لکھنؤ کے مدعیان تہذیب اور قدردانِ سخن کا مذاق اُڑا رہا ہے جہاں اُردو زبان کا شیکسپیر ابدی نیند سو رہا ہے، لیکن ان کی اخلاقی رباعیوں کے پھولوں کی مہک آج بھی اسی طرح قائم ہے اور ہمیشہ قائم رہے گی۔

بے ثباتی دنیا

پرساں کوئی کب جوہر ذاتی کا ہے | ہر گل کو گلہ کم التفاتی کا ہے
شبنم سے جو وجہ گریہ پوچھی تو کہا | رونا فقط اپنی بے ثباتی کا ہے

سالگرہ

دل سے طاقت بدن سے کس جاتا ہے | آتا نہیں پھر کر جو نفس جاتا ہے
جب سالگرہ ہوئی تو عقدہ یہ کھلا | یاں اور گرہ سے اک برس جاتا ہے

موت خاتمہ مصائب

وہ موج حوادث کا تھپیڑا نہ رہا | کشتی وہ ہوئی غرق وہ بیڑا نہ رہا
سارے جھگڑے تھے زندگانی تک انیس | جب ہم نہ رہے تو کچھ بکھیڑا نہ رہا

ہستی ایک خواب ہے:۔

طفلی دیکھی شباب دیکھا ہم نے | ہستی کو حباب آب دیکھا ہم نے
جب آنکھ ہوئی بند عقدہ یہ کھلا | جو کچھ دیکھا سو خواب دیکھا ہم نے

صبح پیری:۔

یہ عمر یوں ہی تمام ہو جائے گی | مرنے کی خبر بھی عام ہو جائے گی
روتے ہو انیس کیا جوانی کے لئے | پیری کی سحر بھی شام ہو جائے گی

الفت قبر:۔

مرمر کے مسافر نے بسایا ہے تجھے
رُخ سب سے پھرا کے مُنہ دکھایا ہے تجھے
کیونکر نہ لپٹ کے تجھ سے سوؤں اے قبر
میں نے بھی جان دے کے پایا ہے تجھے

دنیا گو مگو ہے:۔

لالے سے عیاں بہار سرجوشی ہے
نرگس کو جو دیکھئے تو مدہوشی ہے
کیسی یہ گو مگو ہے اے رب کریم
بلبل نالاں ہے گل کو خاموشی ہے

کر عجز اگر عاقل و فرزانہ ہے
دانائی پہ پھولا ہے تو دیوانہ ہے
تسبیح کے دانوں پر نظر کر ناداں
گردش میں سدا رہتا ہے جو دانہ ہے

انصاف کی نایابی:۔

کچھ فرق کلام کہنہ و نو میں نہیں
منصف ڈھونڈو تو ایک بھی سو میں نہیں
تھا یوں نہ کبھی گوہر مضموں بے قدر
انصاف فلک تیری قلمرو میں نہیں

دوست کی نایابی:۔

مال و زر و افسر و حشم ملتا ہے
ممکن ہے نگیں طبل و علم ملتا ہے
عنقا کو گر و سرخ پارس اکسیر
یہ سب ملتے ہیں دوست کم ملتا ہے

صفتِ پیری:۔

پیری میں یہ تن کا حال ہو جاتا ہے
ہر موئے بدن وبال ہو جاتا ہے
دنیا میں عروج کو بھی اک دن ہے زوال
جب بدر گھٹا ہلال ہو جاتا ہے

خودستائی کی مذمت :۔

رتبہ جسے دنیا میں خدا دیتا ہے — وہ دل میں فروتنی کو جا دیتا ہے
کرتے ہیں تہی مغز ثنا آپ اپنی — جو ظرف کہ خالی ہے صدا دیتا ہے

مذمت حرص و ہوس :۔

کیوں زر کی ہوس میں دربدر پھرتا ہے — جانا ہے تجھے کہاں کدھر پھرتا ہے
اللہ ری پیری میں ہوس دنیا کی — تھک جاتے ہیں جب پاؤں تو سر پھرتا ہے

مذمت سوال :۔

برباد گراں جنس کو بے تول نہ کر — تیرا کوئی مشتری ہو وہ مول نہ کر
اک نان ہے انیس دست دونانِ سوال — خالی ہاتھوں کو اپنے کشکول نہ کر

حصول شہرت اور زحمت

جو سو خرمن سے خوشہ چین ہوتا ہے — دانائے جہاں وہ نکتہ بیں ہوتا ہے
ملتا نہیں نام نیک بے کاہش جاں — کٹتا ہے عقیق تب نگیں ہوتا ہے

عزّتِ نفس :۔

عزت رہے یار و آشنا کے آگے — محجوب نہ ہوں شاہ و گدا کے آگے
یہ پاؤں چلیں تو راہِ مولا میں انیسؔ — یہ ہاتھ جب اٹھیں تو خدا کے آگے

خوبیاں خود ظاہر ہو جاتی ہیں

کیوں زر کی ہوس میں آبرو دیتا ہے — ناداں یہ کیسے فریب تو دیتا ہے
لازم نہیں اپنے منہ سے تعریف انیسؔ — خالص ہے جو مشک آپ بُو دیتا ہے

۲۔ ذاتیہ

اس عنوان کے تحت وہ رباعیاں لکھی گئیں جو کسی نہ کسی طرح انیس کی اپنی ذات سے تعلق رکھتی ہیں، ان میں بعض رباعیاں عام شعراء کے مضامین اور خیالات کی طرح ہیں، مثلاً فخر و خود ستائی، دشمنوں اور حاسدوں کی شکایت، زمانہ کی ناقدر شناسی، اپنے مصائب و آلام، کساد بازاری اور اپنی بدنصیبی، خود ستائی کو شعراء کی زبان میں فخریہ کہا جاتا ہے۔ فخریہ اشعار ہر زبان کے شاعروں نے لکھے ہیں۔ عربی اور فارسی کے شعراء عام طور پر فخریہ لکھتے تھے، اردو شعراء نے بھی ان کا تتبع کیا۔ میر انیس جس خاندان میں پیدا ہوئے، جس ماحول میں اُن کی آنکھیں کھُلیں اور جس فضا میں وہ پروان چڑھے ان کا تقاضا یہ تھا کہ ان میں عزتِ نفس اور خودداری زیادہ ہو، اردو زبان اُن کا ورثہ تھی۔ اہلبیت اطہار کی مداحی میں پانچویں پشت ہوگئی تھی، لکھنؤ آنے کے بعد یہاں جو معرکے ہوئے خاص طور پر مرزا دبیر سے ان حالات کے ہاتھوں مجبور ہو کر انھوں نے فخریہ شاعری کی، اور اپنی زبان، اپنی ذات، اور اپنے کلام پر خود روشنی ڈالی۔

اپنی زبان پر ناز

بے جا نہیں مدحِ شہ میں غرّا میرا
بھرتی سے کلام ہے مُعرّا میرا
مرغانِ خوش الحان چمن بولیں کیا
مرجاتے ہیں سُن کے زمزمہ میرا

خوش فکری

مملوِ دُرِ معنی سے مرا سینہ ہے
دل میں یہ صفائی ہے کہ آئینہ ہے

دُر ریزی

ہر ایک سخن میں رنگ آمیزی ہے — پیری ہو پہ ذہن میں وہی تیزی ہے
گرتے جاتے ہیں یہ دندانِ انیسؔ — تاحال زباں کو شوق دُر ریزی ہے

فخریہ

گلہائے مضامین کو کہاں بند کروں — خوشبو نہیں چھپنے کی جہاں بند کروں
میں باعثِ نغمہ سنجی بلبل ہوں — کھولے نہ کبھی منہ جو زباں بند کروں

مضمون انیسؔ کا نہ چہرا اُترا — اُترا بھی تو کچھ بگڑ کے نقشہ اُترا
نقاش نے سو طرح کی خفت کھینچی — تصویر نہ کھینچ سکی، تو چہرا اُترا

مضمون گوہر ہیں اور صدف مینا ہے — ہے صاف تو یہ کہ قلب بے کینا ہے
آئینہ سا روشن ہے کلام اپنا انیسؔ — ہم اس کو نظر آئیں گے جو بینا ہے

تاثیر کلام :۔

کٹ جاتے ہیں خود رنگ بدلنے والے — کب تھمتے ہیں جو اشک ہیں بہنے والے
اللہ ری ترے سخن کی تاثیر انیسؔ — رو دیتے ہیں مثل شمع جلنے والے

دزدانِ مضامین

کب دزد سے دولت ہنر بچتی ہے — لے بھاگتے ہیں جب کہ نظر بچتی ہے
ممکن نہیں دزدانِ مضامیں سے نجات — سچ ہے کہ گھس سے کب شکر بچتی ہے

مصائب زیست

کس طرح نہ تلخ زندگانی ہوجائے
پتھر پہ یہ دکھ پڑیں تو پانی ہوجائے
اس دم جو شریک درد ہوئے میرا
خورشید کا رنگ زعفرانی ہوجائے

بد قسمتی

گلشن کی کروں سیر تو صحرا ہوجائے
صحرا کا کروں عزم تو دریا ہوجائے
موسیٰ کا عصا بھی ہاتھ آجائے اگر
قسمت سے مری سوزن عصا ہوجائے

کساد بازاری

باندھے ہوئے گوہر سخن لاتے ہیں
بازار جو بند ہے تو شرماتے ہیں
کہتے تھے یہ روز جنس لینے والے
جب اٹھ گئے جوہری تو ہم آئے ہیں

سلام

اُردو شاعری میں مرثیہ کے ساتھ ساتھ سلام کی بھی ابتدا ہوئی، مرثیہ کی طرح اس کا بھی آغاز دکن سے ہوا، دہلی اور لکھنؤ میں اس کو عروج ہوا اور اس نے باقاعدہ ایک علیحدہ صنف کی صورت اختیار کرلی۔

سلام میں فلسفہ، اخلاق، حزن والم کے جذبات، بے ثباتی دنیا، ہستی ناپائدار، دیگر مذہبی و اخلاقی موضوعات بیان کئے جاتے ہیں۔

سلام میں پہلے ردیف کے طور پر 'سلام' کا لفظ استعمال کیا جاتا تھا۔ سلام مربع و منفرد دونوں طرح لکھا جاتا تھا۔ میر و سودا کے وقت تک سلام مربع لکھے جاتے

جاتے تھے، لیکن بعد میں لکھنؤ میں مرثیہ گوئی کی ترقی و اصلاح کے ساتھ ساتھ سلام کی یہ شکل بھی ختم ہوگئی۔

سلام اور مرثیہ میں وہی فرق ہے، جو قصیدہ اور غزل میں ہے۔ سلام کی شکل غزل کی طرح ہوتی ہے۔ تغزل کو قائم رکھتے ہوئے مرثیہ گویوں نے اپنے شاعرانہ جوہر دکھائے ہیں۔ زمانہ کے ہاتھوں مجبور ہوکر، مرثیوں کے خلاف، سلام کے لئے، غزلوں کی بحریں، قافیہ اور ردیف اختیار کرنا پڑتا ہے، البتہ موضوع و مضمون عاشقانہ نہیں بلکہ حزنیہ والمیہ اور زیادہ تر واقعات کربلا کے لئے مخصوص ہے۔

جس طرح غزل گوئی کی محفل کو "مشاعرہ" کا نام دیا گیا اسی طرح "سلام" پڑھنے کی محفل کو "مسالمہ" کہا گیا۔

شمالی ہند میں سودا سے پہلے بھی سلام لکھے گئے لیکن سودا نے سلام میں بھی نئی بنیاد ڈالی جس سے اس کی مقبولیت و افادیت بڑھتی گئی، سودا کے سلام کا نمونہ یہ ہے۔

ادب سے بھیجے ہے تجھ پر ترا غلام سلام — قبول ہو تری خدمت میں یا امام سلام

حسین تجھ کو یہ عرش بریں کرے ہے سلام — وہاں سے آن کے روح الامیں کرے ہے سلام

سودا کے زمانے میں میر، باقی، اسد، محمد تقی سکندر اور گدا ممتاز مرثیہ گو شعراء ہوئے ہیں انھوں نے بھی سلام کہے۔ گدا کے ایک سلام کا مطلع یہ ہے۔

ہے سلام اس پر جو کہتی تھی مرے بیر حسین — خاک میں کیسی ملائی مری تصویر حسین

ان بزرگوں کے بعد، مرثیہ گوئی کا آفتاب نصف النہار پہ پہنچ گیا۔ میر ضمیر، میر خلیق کے بعد میر انیس اور مرزا دبیر نے اس صنف پر کمال حاصل کیا۔ میر انیس کے سلاموں میں فصاحت و سلاست، شگفتگی و دلکشی، بندش کی سادگی اور روانی کے ساتھ درد و اثر بھی

۱؎ سعدی کاکوروی کے سلام مشہور ہیں۔

سب سے زیادہ ہے۔ سلام کی خوبی یہی ہے کہ اس کی طرح شگفتہ ہو، الفاظ سادہ اور سلیس ہوں، بندش نئی اور صاف ہو، مضمون پُر اثر اور درد انگیز ہو، اور ایسی موسیقیت پائی جائے۔ میر انیس کے سلاموں میں یہ سب خوبیاں بدرجۂ اتم موجود ہیں:۔

صبر کرتے تھے سلامی! شہ والا کیا کیا ۔۔۔ اہلِ کیں دیتے تھے مظلوم کو ایذا کیا کیا

شاہ فرماتے تھے پانی نہیں ملتا لیکن ۔۔۔ سامنے آنکھوں کے لہراتا ہے دریا کیا کیا

سرِ شبیر سے کہتے تھے یہ رو رو سجادؑ ۔۔۔ رنج دیتے ہیں مجھے راہ میں اعدا کیا کیا

دیکھ کر فوج حسینی کو عدو کہتے تھے ۔۔۔ ساتھ لائے ہیں جواں سید والا کیا کیا

خط لئے لاشۂ اکبر پہ یہ کہتے تھے امام ۔۔۔ دیکھو بیٹا تمہیں صغرا نے ہے لکھا کیا کیا

مرا راز دل آشکارا نہیں ۔۔۔ وہ دریا ہوں جس کا کنارا نہیں

وہ گل ہوں جدا سب سے ہے جسکا رنگ ۔۔۔ وہ بو ہوں کہ جو آشکارا نہیں

وہ پانی ہوں شیریں نہیں جس میں شور ۔۔۔ وہ آتش ہوں جس میں شرارا نہیں

بہت زال دنیا نے دیں بازیاں ۔۔۔ میں وہ نوجواں ہوں کہ ہارا نہیں

فقیروں کی مجلس ہے سب سے جدا ۔۔۔ امیروں کا یاں تک گزارا نہیں

بچھڑے دوست جب ہوگئی قبر بند ۔۔۔ کھلا اب کہ کوئی ہمارا نہیں

کسی نے تری طرح سے اے انیس
عروسِ سخن کو سنوارا نہیں

نمود و بود کو عاقل حباب سمجھے ہیں ۔۔۔ وہ جاگتے ہیں جو دنیا کو خواب سمجھے ہیں

کبھی برا نہیں جانا کسی کو اپنے سوا ۔۔۔ ہر ایک ذرے کو ہم آفتاب سمجھے ہیں

کریم مجھ کو عطا کر وہ فقر دنیا میں — کہ جس کو فخر رسالتمآب سمجھے ہیں
بھگو کے کھاتے ہیں پانی میں نان خشک کو وہ — اس آبرو کو جو موتی کی آب سمجھے ہیں
شباب کھو کے بھی غفلت وہی ہے پیروں کو — سحر کی نیند کو بھی شب کا خواب سمجھے ہیں
خدا کی راہ میں ایذا سے جن کو راحت ہے — زمین گرم کو وہ فرش خواب سمجھے ہیں

انیس مخمل و دیبا سے کیا فقیروں کو
اسی زمین کو ہم فرشِ خواب سمجھے ہیں

کلام انیس کی خاص خوبیاں

روزمرہ شرفا کا ہو سلاست ہووے — لب وہی سارا ہو متانت ہووے
سامعیں جلد سمجھ لیں جسے صنعت ہووے — یعنی موقع ہو جہاں جس کا عبارت ہووے

لفظ بھی چست ہوں مضمون بھی عالی ہووے
مرثیہ درد کی باتوں سے نہ خالی ہووے

آئندہ اوراق میں میر انیس کے انیس اور معاف پر بحث کی گئی ہے۔ میر انیس کی شاعری کے داخلی اور خارجی اعتبار سے گذشتہ صفحات میں کسی حد تک تفصیلی روشنی ڈالی جا چکی ہے کہ وہ جذبات نگاری، واقعہ نگاری، منظر کشی، کردار نگاری وغیرہ کے بادشاہ ہیں۔

جیسا کہ گذشتہ اوراق میں کہا جا چکا کہ میر انیس نے ایسے خاندان میں پرورش پائی جس کی زبان ٹکسالی زبان سمجھی جاتی تھی اور "شبیر کی مداحی جس کا ایمان و عمل تھا" ان کا ماحول بھی ایسا تھا جس میں زبان کی درستی و اصلاح پر خاص غور کیا جاتا تھا، آتش

و ناسخ کا دور باقی تھا اور ناسخ کی اصلاحی کوششوں کو اہل زبان پسندیدہ نظروں سے دیکھتے تھے۔ عام رجحان غزلوں کی طرف تھا لیکن حکومت وقت کے عقائد اور رجحانات کے اثرات عوام پر گہرے پڑتے جا رہے تھے۔ شعراء کے لئے یہ موقع "ہم خرما و ہم ثواب" کے مصداق تھا۔ ذاتی اور مذہبی عقیدتمندی، شاہان اودھ کی خوشنودی و سرپرستی نے مرثیہ گویوں کو وہ عروج بخشا کہ باید و شاید۔ میر ضمیر اور میر خلیق کا ڈنکا بج رہا تھا۔ مرزا دبیر اور میر انیس مرثیہ گوئی کے آسمان پر آفتاب و ماہتاب بن کر طلوع ہو رہے تھے۔ میر و مرزا کے کلام کی چمک دمک کے سامنے تمام مرثیہ گویوں کے کلام کی چمک ماند پڑ گئی۔ ان دونوں بزرگوں میں بھی جو شہرت و مقبولیت میر انیس کے کلام کو نصیب ہوئی اس سے مرزا دبیر محروم رہے۔ بقول سید دار عباس "میر انیس کو یہ مقبولیت انکی زبان کی پاکیزگی اور بیان کی خوبی کی بدولت ہوئی۔ انھوں نے جو کچھ لکھا اس انداز سے لکھا اور اس زبان میں لکھا جو کانوں کے راستے دل کی گہرائیوں تک اثر کرتا تھا۔ اور زبان سے بے ساختہ واہ واہ سبحان اللہ نکل جاتا تھا۔ مختصر یہ کہ ان کے کلام میں فصاحت و بلاغت، روزمرہ و محاورہ صنائع و بدائع، استعارات و تشبیہات، سلاست و روانی، سادگی و پرکاری کے ساتھ ساتھ تسلسل بیان بدرجہ اتم موجود ہے۔

یہاں اختصار کے ساتھ (انیس و دبیر سے موازنہ) ہر ایک کی تعریف کے بعد چند مثالیں درج کی جاتی ہیں۔

۱۔ فصاحت | فصاحت کے لئے تین باتیں ضروری ہیں۔

۱۔ الفاظ میں تنافر نہ ہو۔

۲۔ الفاظ باہم نامانوس نہ ہوں۔

۴۔ قواعد مروجہ کے خلاف نہ ہوں۔

میرانیس نے ان تینوں باتوں کا خیال رکھا ہے اور انھوں نے اس امر کی کوشش کی ہے کہ کوئی غیر فصیح لفظ ان کے کلام میں نہ آنے پائے، بلکہ ان کو الفاظ پر اتنی قدرت ومہارت ہے اور وہ الفاظ کے اس قدر جوہری ہیں کہ وہ ہر موقع کے لئے بہتر الفاظ اس ترکیب کے ساتھ استعمال کرتے ہیں کہ کلام میں چار چاند لگ جاتے ہیں۔

فصاحت میں صرف لفظ کا فصیح ہونا ہی کافی نہیں ہے بلکہ جن الفاظ کے ساتھ وہ ترکیب میں آئے، ان کی ساخت، ہیئت، نشست، سبکی اور گرانی کے ساتھ اسکو خاص تناسب اور توازن ہو، مثلاً صحرا اور جنگل دونوں ہم معنی ہیں اور دونوں فصیح ہیں، میرانیس نے دونوں لفظوں کو ہم معنی ہونے کی حیثیت سے استعمال کیا ہے لیکن جس جگہ جو لفظ استعمال کیا ہے۔ دوسرا لفظ باوجود اس کے ایک ہی معنی رکھتا ہے استعمال نہیں ہو سکتا۔ جیسے ۔ ع

فرمایا آدمی ہے کہ صحرا کا جانور

جنگل کا جانور کہو تو مصرعہ بیس پھسا ہو جائے گا اور لفظ ہی نہیں بلکہ پورا مصرعہ غیر فصیح ہو جائے گا۔ لیکن

طائر ہوا میں مست، ہرن سبزہ زار میں   جنگل کے شیر گونج رہے تھے کچھار میں

اس میں جنگل کے بجائے صحرا استعمال کیا جائے تو شعر کی فصاحت اور شیر کی گرج ختم ہو جائے گی۔ اسی طرح شبنم اور اوس ہم معنی ہیں لیکن ایک لفظ کی جگہ دوسرا لفظ استعمال کرنے سے غیر فصیح ہو جائے گا۔

شبنم کا استعمال | "شبنم نے بھر دئے ہیں کٹورے گلاب کے"

اوس کا استعمال

کھاکھا کے اوس اور بھی سبزہ ہرا ہوا ‏ ‏ ‏ ‏ تھا موتیوں سے دامنِ صحرا بھرا ہوا

الفاظ کے توازن و تناسب سے کلام میں جو فرق پیدا ہوتا ہے وہ ان مثالوں سے واضح ہو جائے گا۔

حضرت علی اکبر کے اذان دینے کی تعریف :۔

"تھا بلبلِ حق گو کہ چہکتا تھا چمن میں"

ایک اور موقع پر یہی مضمون اس طرح ادا کیا ہے ۔

"بلبل چہک رہا تھا ریاضِ رسول میں"

ترکیب کی ساخت نے دونوں مصرعوں میں کس قدر فرق کر دیا ۔

کلام کی اصلی ترتیب قائم رہنے سے شعر صاف، برجستہ، رواں اور ڈھلا ہوا ہوتا ہے۔ حالانکہ نثر کی سی ترتیب "نظم میں قائم رکھنا کارے دارد" ہے لیکن کوشش یہی کرنا چاہئے کہ اگر اصلی ترتیب قائم نہیں رہ سکتی تو قریب قریب نثر کے ہو۔ میر انیس کے کلام میں یہ بات سب سے زیادہ پائی جاتی ہے ۔

حضرت صغریٰ، حضرت زینب سے کہتی ہیں ۔

صغریٰ نے کہا آپ کی باتوں کے میں قرباں ‏ ‏ ‏ ‏ تم جان بچالو کہ میں لونڈی ہوں پھوپھی جان

بیٹی ہو علی کی مری مشکل کرو آساں ‏ ‏ ‏ ‏ جیتی رہی صغریٰ تو نہ بھولے گی یہ احساں

کچھ بات بجز گریہ وزاری نہیں کرتیں

اماں تو سفارش بھی ہماری نہیں کرتیں

الفاظ کا استعمال مضامین کی نوعیت سے | میر انیس نے مضامین کی نوعیت

کے اعتبار سے الفاظ استعمال کئے ہیں، رزم و بزم میں، فخر و ہجو میں، نوحہ و سلام میں جہاں جس قسم کا موقع ہوا اسی قسم کے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔

رزمیہ فخر

طاقت اگر دکھاؤں رسالتمآب کی
رکھدوں زمیں پہ چیر کے ڈھال آفتاب کی

جلال اور غیظ

کم تھا نہ ہمہ اسد کردگار سے
نکلا ڈکارتا ہوا ضیغم کچھار سے

انتخاب بحر: میر انیس پہلے بڑی بحروں میں مرثیے لکھتے تھے جیسے
"جب مشک بھر کر نہر سے عباس غازی گھر چلے"
لیکن بعد میں ان کو بے اثر دیکھ کر انھوں نے تین چار بحریں خاص کر لیں جن میں چند خصوصیتیں پائی جاتی ہیں۔

۱۔ ایسی بحر جو رزم و بزم دونوں کے لئے موزوں ہیں۔
"حشر برپا تھا کہ تیغ حرِ ذی جاہ چلی"

۲۔ ایسی بحر جن میں موزونیت و موسیقیت زیادہ ہوتی ہے اور جو کانوں کو بھلی معلوم ہوتی ہے۔
"غربت کی بھی ہوتی ہے عجب صبح عجب شام"

حسن قافیہ و ردیف: اردو میں قافیہ و ردیف کی پابندی سے اگر ایک طرف خیالات و مضامین اور انداز بیان محدود ہو جاتا ہے، تو دوسری طرف ردیف اور قافیہ سے اشعار میں وہی دلکشی، حسن، موزونیت اور موسیقیت پیدا ہوتی ہے جو راگ میں تال اور

ردیف و قافیہ کے التزام کے ساتھ شعر کی روح کو قائم ہی نہیں رکھا بلکہ اُسے تازگی اور زندگی بخشی۔

کیں صفیں صاف مگر منہ کی صفائی نہ گئی   سیکڑوں خون کئے اور کہیں آئی نہ گئی

شہ کے غضب سے مانگتی تھی ہر کماں اماں   مضطر زمیں تھی مانگتا تھا آسماں اماں
دیتے نہ تھے کسی کو امام زماں اماں   ہر صف میں تھا یہ شور کہ مولائی اماں اماں

بلاغت: ایسا کلام جو اقتضائے حال کے موافق ہو اور فصیح بھی ہو بلیغ کہلاتا ہے۔ بلاغت کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ الفاظ کی بلاغت

۲۔ معانی کی بلاغت

الفاظ کی بلاغت یہ ہے کہ کوئی لفظ غیر فصیح نہ ہو اور نہ بے موقع استعمال ہوا ہو۔ معانی کی بلاغت یہ ہے کہ جو واقعہ یا قصہ بیان کیا جائے وقت اور حالت کے بموجب ہو۔ اور اسکو اس انداز سے بیان کیا جائے کہ اس کی تمام خصوصیات سامنے آجائیں اور دلوں پر دبی اثر ہو بلکہ اس سے زیادہ ہو جو خود واقعہ کے پیش آنے سے پڑتا۔ میر انیس کے کلام میں یہ وصف عموماً ملتا ہے۔

سفر میں عورتوں کا صلاح دینا

لے لے بلائیں یہی سب کرتی ہیں تقریر   اس گرمی کے موسم میں کہاں جاتے ہیں شبیر
سمجھاتی نہیں بھائی کو اے شاہ کی ہمشیر   مسلم کا خط آئے تو کریں کوچ کی تدبیر
للہ ابھی قصر پیمبر کو نہ چھوڑیں مولا

حضرت امام حسینؑ کی رخصت کے وقت حضرت شہر بانو فرماتی ہیں ۔

کچھ حق میں اس کنیز کے فرما کے جائیے　　صاحب! کسی جگہ مجھے بٹھلا کے جائیے

حضرت علی اصغر پیاس کی شدت سے جاں بلب ہیں، معصوم بچے کو تڑپتا ہوا دیکھ کر ماں کے دل پر کیا گزرتی ہے اس کو میر انیس نے کس قدر بلیغ اور موثر پیرایہ سے بیان کیا ہے۔

کیا ہو گیا اس صاحب اقبال کو میرے　　بے بے نے جاتی ہے اجل لال کو میرے

حریف مخالف کا ذکر کرنا اور بلاغت قائم رکھنا، بڑا نازک اور دشوار مسئلہ ہے، حریف مقابل کو اگر حقیر و ذلیل کمزور و بزدل بیان کیا جائے تو اس پر فتح حاصل کرنا کوئی کمال نہیں۔ ایسے موقع پر میر صاحب بڑی خوبی سے ان مشکلوں کو حل کر لیتے ہیں اور مدح و ذم کو پہلو بہ پہلو رکھتے ہوئے بھی بلاغت پر آنچ نہیں آنے دیتے ۔

حریف کی تعریف

نکلا ادھر سے بہر وغا ایک سپاہ　　زور آور و تہمتن و مغرور و کینہ خواہ

کاندھے پہ گرز بر میں زرہ خشمگیں نگاہ　　سر پر مثال قبضۂ تیغ آہنی کلاہ

آمد شقی کی تھی کہ رواں رود نیل تھا

ہیبت میں تھا جو دیو تو ہیکل میں پیل تھا

ظاہر ہے کہ ایسے دیو پیکر دشمن کو جو شکست دے گا اس کی طاقت کی عظمت کا سکہ خود بخود دل پر بیٹھ جاتا ہے۔ بلاغت میں تسلسل بیان قائم رہنا چاہئے اور کہیں سے بھی غیر مربوط نہ ہونا چاہئے۔ میر انیس نے تسلسل بیان بدرجہ اتم قائم رکھا۔ ان کا ایک کمال یہ بھی ہے کہ مختلف واقعات کو اس طرح سے بیان کرتے ہیں کہ وہ سب ایک مسلسل زنجیر بن جاتے ہیں۔ جس کی ہر ایک کڑی آپس میں ملی ہوئی ہوتی ہے ۔ ان کے

کسی مرثیہ کو لے لیجئے اس میں متعدد واقعات کا بیان ہوگا لیکن کیا مجال کہ تسلسل بیان ختم ہو'۔

غرض بلاغت کی سیکڑوں جزئیات ہیں، سخن سنج ان جزئیات کو بیان کرنے میں اپنا کمال دکھاتے ہیں۔ سخن شناس انھیں پڑھ کر جھومتے اور سر دُھنتے ہیں اور یہ سب مذاق سلیم پر مبنی ہے۔ سخن سنجی و سخن فہمی و سخن شناسی، اکتسابی سے زیادہ خداداد ہے، اسی لئے شاعر کو تلامیذالرحمٰن کہا گیا ہے۔ میر انیس نے جس طرح واقعات کربلا کا ایک ایک جزو بیان کیا ہے' وہ انھیں کا حصہ ہے' ایک دو نہیں سیکڑوں مثالیں ملیں گی' ہر مرثیہ ان کی قادرالکلامی کا مکمل ثبوت ہے۔

صنائع و بدائع | صنائع و بدائع کا استعمال اُسی وقت حسن و خوبی پیدا کرتا ہے جب کہ وہ حسب موقع اور مناسب طور پر استعمال کئے جائیں جیسے طعام میں نمک' اُردو شاعری میں جہاں اور بھی بہت سی خرابیاں ہیں ایک سب سے بڑا عیب یہ بھی ہے کہ ہمارے شعراء کی اکثریت نے کلام میں صنائع و بدائع کا استعمال اس قدر کثرت سے کیا ہے کہ حسن کلام نے پناہ مانگ لی۔ لکھنؤ کی مصنوعی تہذیب میں یہ رنگ کچھ اسقدر جما کہ شاعر لفظی صنعت گری پر زمین آسمان کے قلابے ملانے لگا۔ مبالغہ' ایہام' مناسبات لفظی کو شاعری کا معراج کمال سمجھا جاتا' میر انیس کے زمانہ میں لکھنؤ کا ہر شاعر اسی رنگ میں رنگا ہوا تھا۔ میر انیس بھی اس رنگ سے متأثر ہوئے۔ ماحول کے اثرات سے بچ بھی کیسے سکتے تھے۔ لیکن ذوق سلیم کی رہنمائی کام آئی اور انھوں نے بہت کم صنعتیں استعمال کیں اور بعض ناکارہ صنعتیں جیسے صنعت اہمال' لزوم مالایلزم وغیرہ نہایت کم برتیں اور جس قدر صنعتیں استعمال کیں' ان سے محض سامعین و حاضرین کو خوش کرنا

تھا۔ خود ان کی فطرت کا تقاضا یہ نہ تھا، ایک دوست کے دریافت کرنے پر کہ لفظی رعایتوں اور صنائع بدائع کو وہ پسند کرتے ہیں، انھوں نے جواب دیا کہ

"نہیں، لیکن آخر لکھنؤ میں رہنا ہے۔"

اور لکھنؤ کی سکونت کا ہی یہ طفیل ہے کہ میر انیس نے جس چیز کو مجبوراً اختیار کیا وہ اُردو شاعری کا زیور ہے، اُس کے حسن کی آرایش و زیبائش کو دوبالا کرتی ہے، اسمیں کوئی شک نہیں کہ مبالغہ کی ایک صنعت ایسی ضرور ہے جس میں میر صاحب بہت آگے بڑھ گئے ہیں حتیٰ کہ قصیدہ نگار شعراء، سودا و ذوق سے بھی آگے ہیں، لیکن اور دوسری تمام صنعتیں انھوں نے اعتدال سے استعمال کیں۔ جس سے حسن کلام دوبالا ہو گیا۔ یہاں چند صنعتوں کا مختصر ذکر کیا جاتا ہے۔

۱۔ ایہام | کلام میں جب کوئی ایسا لفظ استعمال کیا جاتا ہے جس کے معنی تو دو ہوتے ہیں لیکن مراد صرف ایک معنی ہوتا ہے جس کو مقدم یا موخر سے مناسبت ہوتی ہے اُردو میں اس صنعت کی طرف ابتدا ہی سے میلان رہا۔ اور یہ صنعت مضمون بندی کی ایک بڑی عمدہ صنعت خیال کی جاتی ہے۔ میر انیس نے اس صنعت کو بکثرت استعمال کیا اور نہایت بے تکلفی کے ساتھ۔

جب تک یہ چمک مہر کے پرتو سے نہ جائے　　اقلیم سخن میری قلمرو سے نہ جائے

تعریف میں چشمہ کو سمندر سے ملا دوں　　قطرہ کو جو دوں آب تو گوہر سے ملا دوں

اللہ رے سخن کی تیرے تاثیر انیس　　رو دیتے ہیں مثل شمع جلنے والے

اگر بزم عزائے شہ میں رونا ہر آنکھ پہ فرض عین ہو جاتا ہے

۲۔ مبالغہ | کلام میں جب کہ کسی کی تعریف یا تنقیص بڑھا چڑھا کر کی جائے۔ اردو شاعری میں شعرا نے مبالغہ آرائی کی حد کردی، مبالغہ کے مدارج تین ہیں۔ تبلیغ۔ اغراق۔ غلو۔ شعرا نے آخری درجہ اختیار کرلیا، یعنی غلو میں غلو کیا، اور نتیجہ یہ ہوا کہ خیال آرائی اور مبالغہ آرائی تو رہ گئی، مضمون حقیقت سے اور عقل سے دور، اور عقل سے دور، ہوگیا۔ قصائد میں ممدوح کی تعریف میں بے انتہا مبالغہ آرائی سے کام لیا گیا، مرثیے میں بھی اس صنعت کا خوب استعمال کیا گیا۔ میر انیس نے بھی مبالغہ سے کام لیا اور اکثر اوقات وہ حد اعتدال سے زیادہ ہوگئے۔ ماہی جو سیخ موج سے آئی کباب تھی

سرخی اُڑی تھی، پھولوں سے، سبزی گیاہ سے سایہ کنوئیں میں اترا تھا پانی کی چاہ سے

گر آنکھ سے نکل کے ٹھہر جائے راہ میں پڑ جائیں لاکھ آبلے پائے نگاہ میں

تاہم انھوں نے مبالغہ میں سلامت روی اور اعتدال کو قائم رکھا۔

شیر اٹھتے نہ تھے خوف کے مارے کچھار سے آہو نہ منہ نکالتے تھے سبزہ زار سے

آئینہ مہر کا تھا مکدر غبار سے گردوں کو تپ چڑھی تھی زمیں کے بخار سے

گرمی سے مضطرب تھا زمانہ زمین پر

بھن جاتا تھا جو گرتا تھا دانہ زمین پر

۳۔ مراعات النظیر | کلام میں رعایت لفظی کی بھرمار ہوجائے۔ انیس کے زمانہ میں یہ صنعت شعراء کا سرمایۂ کمال سمجھی جاتی تھی، اس کو بقول علامہ شبلی "مہذب ضلع جگت" کہہ سکتے ہیں۔ امانت لکھنوی نے اس میں کمال حاصل کیا۔

"بھیڑیے ملتے ہیں آنکھیں تری گرگانی پر"

اور ایک امانت ہی کیا لکھنؤ کی شاعری میں یہ صنعت، ہر شاعر کے دل پر قبضہ جمائے ہوئی تھی، میر انیس کے یہاں بھی اس صنعت کی بہتات ہے لیکن ابتذال ہونے کے بجائے بعض جگہ اس سے وہ نہایت پُر لطف بات پیدا کرتے ہیں۔

ہر نخل برومند ہے یا حضرت باری پھل ہم کو بھی مل جائے ریاضت کا ہماری

اصغر سے اگر اکبر مہ رو نہ ملے گا تم ہاتھ سے جاؤ گے تو بازو نہ ملے گا

فرماتے تھے حسین کہ او خانماں خراب دریا کو خاک جانتا ہے ابن بوتراب

اس ضعف میں لغزش سے نہ وہ پانوں تھے آگاہ پایا تھا ثباتِ قدمِ پائے یداللہ

اب تک یہ لڑائی کے نہیں ڈھنگ سے واقف دونوں میں ایک بھی نہیں چھ نگ سے واقف

۴۔ حسن تعلیل | کلام میں ایسی چیز کو کسی چیز کی علت فرض کر لینا جو حقیقت میں اس کی علت نہ ہو، حسن تعلیل ہے، یہ صنعت نہایت لطیف ہے اور شاعرانہ نزاکت و تخیل

کی بلندی کی بہترین مثال :-

میرانیس نے اس صنعت کو خوب استعمال کیا ہے اور حق یہ ہے کہ یہ انھیں کی صنعت کاری ہے، جس نے ان کے کلام کی زیبائش میں وہ کشش پیدا کی جو آج تک کسی بسترنہ ہو سکی۔

فرات کی موجوں کو کنارے پر سر پٹکنے کی وجہ ملاحظہ ہو۔

پیاسی جو تھی سپاہ خدا تین رات کی ساحل سے سر پٹکتی تھیں موجیں فرات کی

دشمنوں پر رعب و دبدبہ تو تھا ہی، دشمنوں کے اسلحوں پر اس قدر خوف طاری تھا کہ تلواریں نیام سے اپنا سر نہیں نکالتی تھیں۔

ڈر سے نہ بڑھاتے تھے جو سرکش قدم اپنے تیغیں بھی نیاموں میں چرائے تھیں دم اپنے

چند اور مثالیں

ڈر سے ہوا فرات کی موجوں میں اضطراب اور آب میں سروں کو چھپانے لگے حباب

تھم گیا طبل وغا کی بھی وہ آواز کا جوش ہو گیا جوڑ کے ہاتھوں کو جلاجل خاموش

دریا نہ تھمتا خوف سے اس برق تاب کے لیکن پڑے تھے پاؤں میں چھالے حباب کے

۵ - صنعت طباق یا تضاد صنعت میں دو متضاد یا مقابل چیزوں کو یکجا جمع کرنا، میرانیس نے اس کو نہایت بے تکلفی کے ساتھ برتا ہے۔

میری قدر کر اے زمینِ سخن کہ میں نے تجھے آسماں کر دیا

پیچھے قافلہ سے رہنا نہ انیسؔ اے عمر دراز تیری کوتاہی ہے

استادہ آب میں یہ روانی خدا کی شان پانی میں آگ، آگ میں پانی خدا کی شان۔

ان مصرعوں کی برجستگی ملاحظہ ہو۔

ع بانو یہ رہے یاد ہمیں بھول نہ جانا

ع فاقے سے تین دن کے مگر زندگی سے سیر

ع قرآں میں کیا خفی ہے کہ ہم پر جلی نہیں

ع پانی ہے میرے زور کے آگے ہوا کا زور

۶۔ **تنسیق الصفات** | کلام میں ایک ہی وزن یا ایک ہی قسم کے چند الفاظ مسلسل آنا۔ اس تکرار سے کلام کی روانی اور موسیقیت میں ایک خاص لطف پیدا ہو جاتا ہے۔

تلوار | اک گھاٹ پہ تھی آگ بھی، پانی بھی، ہوا بھی + امرت بھی ہلاہل بھی، مسیحا بھی، قضا بھی

گھوڑا | سمٹا، جما، اڑا، ادھر آیا، ادھر گیا + چمکا، پھرا، جمال دکھایا، ٹھہر گیا

کوفہ میں یہی معرکہ دن بھر نظر آیا شمر آیا، سنان آیا، حُر آیا، عمرو آیا

بڑھتے تھے جو پیرے سے بڑے بول بول کے پہلے انہیں کو مار لیا رول رول کے

حملہ کیا جو تیغ دو دم تول تول کے ہتھیار سب نے پھینک دئے کھول کھول کے

۷۔ **لف ونشر** | کلام میں پہلے چند باتوں کا ذکر کرنا پھر ان کے متعلق بیان کرنا، اگر یہ بیان ترتیب سے ہو تو اسے "لف ونشر مرتب" کہتے ہیں اور اگر ترتیب سے نہ ہو تو اسے "لف ونشر غیر مرتب" کہتے ہیں۔ میر انیس کے کلام میں دونوں طرح کے لف ونشر ملتے ہیں۔

واللیل والضحیٰ، رُخ روشن، خطِ سیاہ — لعل وغزال وگل، لب ورخسار وچشم شاہ

چھپتی تھیں، بھاگی جاتی تھیں، گرتے تھے خاک پر — قبضوں سے تیغیں، جسم سے روحیں، تنوں سے سر

۸ ۔ **تلمیح** | کلام میں کسی مشہور واقعہ، یا قصّہ کی طرف اشارہ کرنا، مرثیوں میں یہ صنعت کافی استعمال کی گئی، میر صاحب نے اس کو نہایت خوبی سے استعمال کیا، انھوں نے آیات وروایات واحادیث، عربی فقرے، بڑی خوبی اور صفائی سے بیان کئے ہیں ۔

حضرت امام حسینؑ کا رجز :۔

کس کے لئے اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ آیا — اَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ کا مزا ہے کسے پایا
ہے اَنْفُسَنَا اَنْفُسَکُمْ سے اشارا — اللہ نے کس گھر میں ستارے کو اتارا

انصاف کا اس وقت طلبگار ہوں تم سے — ہے کون مزا آیۂ لَا اَسْئَلُکُمْ سے

انیس رانڈوں میں ہے اک دخترِ فرزند نبی — خوگرِ سینۂ دلبند رسولِ عربی

مہملہ کلام میں ایسے الفاظ لانا، جو بے نقطہ ہوں ۔ اس صنعت کو مہملہ کہتے ہیں ۔ یہ صنعت محض طباعی پر مبنی ہے اس سے شعر وادب کو فائدہ کے بجائے نقصان ہوا فیضی نے بے نقطہ تفسیر لکھی، مرزا دبیر اور میر انیس دونوں نے اپنی اپنی طبیعت کا زور دکھایا ہے ۔ میر انیس کی طباعی ملاحظہ ہو ۔

وہ طاہر واطہر ہوا گر معرکہ آرا — معلوم ہوا حملہ اسد اللہ کا سارا
آگاہ ہو کس طرح کہو عمرو کو مارا — صمصام کا اک وار ہوا کس کو گوارا

واللہ گر اک دم کو وہ صمصام علم ہو
ہر روح کو اس دم ہوسِ ملک عدم ہو

کس کا اسد اللہ سا ہوا والد مرحوم　　حلّالِ مہم، مالک کل، طاہر و معصوم
صدر دو سرا رحم دل و سرورِ مظلوم　　آسودہ ہر اک سالک و گمراہ و محروم
معصوم کا دلدار ہو سالارِ اُمم ہو
اولاد کا اس عالم و عادل کا الم ہو

اس طرح کا والا ہمم اس طرح کا سردار　　اس طرح کا عالم کا مدد اور مددگار
وہ مصدر الہام احد محرمِ اسرار　　وہ اصل اصول کرم داورِ دادار
حاصل اگر اک مردِ دل آگاہ کو مارا
مارا اگر اس کو اسد اللہ کو مارا

روزمرہ، محاورہ بقول صاحب یادگار انیس :— لکھنؤ برسہا برس سے ادب کا مرکز بن گیا تھا اور خصوصیت سے میر انیس نے جس خانوادہ میں آنکھ کھولی تھی وہ پشتہا پشت سے زبان کی درستی و اصلاح، صفائی و پاکیزگی کے لئے مشہور تھا، میر انیس کے بزرگ اس دفتر سے وابستہ تھے جو بیگمات کی زبان سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ لکھتا تھا، اس طرح روزمرہ اور محاورہ پر ان کی نظر بڑی گہری اور وسیع تھی۔ اپنے روزمرہ کی بابت وہ خود فرماتے ہیں :-

مرغانِ خوش الحان چمن بولیں کیا　　مرجاتے ہیں سُن کے روزمرّہ میرا

جو الفاظ اہل زبان کی بول چال میں استعمال ہوتے ہیں، ان کو روزمرّہ کہتے ہیں۔ روزمرّہ مفرد الفاظ میں استعمال نہیں ہوتا، ہمیشہ مرکب لفظوں میں مستعمل ہوتا ہے جیسے صبح و شام،

دن رات، سات آٹھ وغیرہ۔ محاورہ کے لغوی معنی تو بات چیت کرنے کے ہیں لیکن اصطلاح میں خاص اہل زبان کے روزمرّہ یا بول چال یا اسلوب بیان کا نام محاورہ ہے۔ روزمرّہ اور محاورہ کے لئے فصیح ہونا لازمی ہے۔ میر انیس کے کلام میں نہایت کثرت سے روزمرّہ اور محاورہ پائے جاتے ہیں، بلکہ زیادہ صحیح یہ ہے کہ شاید ہی ان کا کوئی بند روزمرّہ اور محاورہ سے خالی ہو۔

وہ کوس کڑے اور پہاڑوں کی وہ راہیں ۔۔۔ وہ دھوپ کی شدت تھی کہ جلتی تھی نگاہیں
دشوار تھا پانی کسی چشمے سے جو چاہیں ۔۔۔ اٹھتا تھا دھواں دل سے نکل جاتی تھیں آہیں
سو تلا گئے تھے چاند سے منہ سیم بروں کے
ثابت تھا کہ خورشید برابر ہے سروں کے

تعریف کریں ڈر کے تو خورسند نہ ہونا ۔۔۔ امداد سے کسی بات پہ تم تند نہ ہونا

زندہ نہ محمد ہے نہ اب عون ہے بیٹا ۔۔۔ تم بھی جو نہ پوچھو تو مرا کون ہے بیٹا

کہتے تھے راہ میں نہ کہ دار اپنا چل گیا ۔۔۔ افسوس ہے کہ ہاتھ سے دریا نکل گیا

استعارات و تشبیہات | تشبیہات و استعارات سے کلام میں حسن پیدا ہو جاتا ہے، اشارے، رمز اور کنائے انداز گفتگو کی جان ہیں، بشرطیکہ متکلم مذاق سلیم رکھتا ہو، اردو شاعری میں جب تک تشبیہ و استعارہ تکلف اور تصنع سے علٰحدہ رہے اور ان کا

بے تکلف استعمال کیا گیا، کلام کا حسن نکھر تا گیا اور اس کی دل کشی اور رعنائی بڑھتی گئی، لیکن جب تصنع و تکلف کا غلبہ ہو گیا، تو تشبیہات و استعارات کے استعمال کرنے کا انداز بھی بدل گیا، اور اہل نظر کے لئے 'یہ مصنوعی حسن' نفرت و حقارت کا باعث بن گیا۔

تشبیہ کی دو قسمیں ہیں۔ مفرد اور مرکب۔ مفرد تشبیہ وہ ہے جس میں ایک چیز کو کسی دوسری چیز سے تشبیہ دی جائے جیسے چہرے کو چاند سے، چشم کو نرگس سے۔

مرکب تشبیہ وہ ہے جس میں کئی چیزوں کو ملاکر، یا چند اشیاء کی ترکیب سے جو مجموعی شکل و صورت پیدا ہو اس کا بیان کسی چیز سے تشبیہ دے کر کرنا۔ جیسے برسات کی اندھیری رات میں جگنو اس طرح چمکتے تھے جیسے آسمان پر ستارے۔

میر انیس کی تشبیہات میں حسب ذیل خصوصیات پائی جاتی ہیں۔

۱۔ اکثر تشبیہات مرکب ہیں۔

۲۔ جو تشبیہیں انھوں نے استعمال کیں، وہ فطرت کے بموجب ہیں، اسی لئے بہت جلد سمجھ میں آجانے والی اور ذہن کو منتقل کرنے والی ہیں اور تشبیہ کا سب سے بڑا کمال یہ ہے۔

۳۔ تشبیہ حسن و قبح کے لئے استعمال کی جاتی ہے، جب کسی کی خوبی کو کسی چیز سے تشبیہ دیتے ہیں تو اُسے تشبیہ بالمدح کہتے ہیں لیکن جب کوئی حقارت یا خرابی کا پہلو نکلتا ہے تو اُسے تشبیہ بالذم کہتے ہیں۔ میر انیس نے دونوں اغراض کے لئے تشبیہ استعمال کی لیکن کہیں بھی اپنے ہیرو کی رفعت و منزلت، شان و شوکت پر حرف نہیں آنے دیا۔ تشبیہ بالذم بالمدح میں تبدیل کر دینا میر انیس کا کمال ہے۔ مثلاً حضرت عباس پر جب ہر طرف سے برچھیاں لگنے لگیں تو اس حالت کو اس طرح ظاہر کیا ہے۔

یوں برچھیاں چار طرف اس جناب کے　　جیسے کرن نکلتی ہے گرد آفتاب سے

اسی طرح جب تمام اہلبیت کو ایک ہی رسی میں باندھا گیا اور ان کو قید کر لیا گیا، تو میر انیس نے کس خوبی سے یہ حالت ظاہر کی ۔

گردنیں بارہ اسیروں کی ہیں اور ایک رسن جس طرح رشتۂ گلدستہ میں گلہائے چمن

مقتل میں حضرت امام حسین علیہ السلام پر حملوں کی شدت کا بیان اس طرح کیا ۔

مقتل میں کیا ہجوم تھا اس نور عین پر پروانے گر رہے تھے چراغ حسینؑ پر

لیکن دشمن کی ہیبت و طاقت، رعب و دبدبہ، بدنمائی و بدطینتی کے سلسلہ میں تمام تشبیہات میں ذم کا پہلو اختیار کیا ہے ۔

ع گھوڑے پہ تھا شقی کہ پہاڑی پہ دیو تھا ۔ یا

جوش غضب سے سرخ ہوئی چشم نابکار مثل تنور منہ سے نکلنے لگا بخار

۴ ۔ میر انیس نے محسوسات سے تشبیہات زیادہ دی ہیں، ان سے مشبہ کی تصویر فوراً سامنے آجاتی ہے اور بات فوراً سمجھ میں آجانے کی وجہ سے کافی لطف اور حظ حاصل ہوتا ہے ۔

یوں روح کے طائر تن و سر چھوڑ کے بھاگے جیسے کوئی بھونچال میں گھر چھوڑ کے بھاگے

بھگدڑ کو بھونچال کی حالت سے تشبیہ دینا، بھگدڑ کا پورا نقشہ آنکھوں کے سامنے کر دیا ہے ۔

دو حریف برچھیوں سے حملہ کر رہے ہیں اور برچھیوں کی انیاں باہم ٹکراتی ہیں اس کو اس طرح لکھا ۔

ع ۔ دو سانپ گتھ گئے، تھے زبانیں نکال کے ۔ یا

ع ۔ شمعوں کی تھیں لویں کہ ملیں اور جدا ہوئیں ۔

کالی وہ ڈانڈ اور وہ چمکتی ہوئی سناں   غل تھا کہ اژدہا ہے نکالے ہوئے زباں

ڈھال پر تلوار کو کس آسانی سے روکنا دکھایا ہے اور کیا عمدہ تشبیہ دی ہے۔

یوں روکتے تھے ڈھال پہ تیغ جھول کو   جس طرح روک لے کوئی شہ زور پھول کو

غیظ اور غضب کی حالت۔

یوں غیظ تھا عمرو کی طلب سے دلیر کو   جس طرح ٹوک دے کوئی غصہ میں شیر کو

۵۔ مبالغہ آمیز تشبیہ | میر انیس نے مبالغہ آمیز تشبیہیں بھی استعمال کی ہیں؛ اور جو بجائے خود نہایت اعلیٰ درجہ کی ہیں لیکن مبالغہ کی وجہ سے تشبیہ کی اصلی غرض و غایت مفقود ہو گئی۔

پانی تھا آگ گرمی روزِ حساب تھی   ماہی جو سیخ موج تک آئی کباب تھی

گھوڑا۔

سیماب تھا زمیں پہ فلک پر سحاب تھا   دریا پہ موج تھا تو ہوا پر عقاب تھا

تلوار۔

چار آئینہ کے پار تھی اس آب و تاب سے   جس طرح برق گر کے نکل جائے آب سے

استعارہ | کلام میں جب صرف مشبہٌ بہ کا ذکر کر کے مشبہ مراد لیں اور الفاظ اپنے اصلی معنوں کے بجائے مجازی معنوں میں استعمال کئے جائیں، اسے استعارہ کہتے ہیں —
میر انیس نے استعارہ استعمال کرنے میں کمال دکھایا ہے۔

حضرت عباس کا حملہ کے وقت نکلنا۔

ضیغم ڈکارتا ہوا نکلا کچھار سے
بیٹھا ہے شیر بنجہ کو ٹیکے ترائی میں

یا حضرت علی اکبر کا اذان دینا:۔

بلبل چہک رہا تھا ریاضِ رسولؐ میں
تھا بلبلِ حق گو کہ چہکتا تھا چمن میں

اسی طرح کنایہ، استعارہ بالکنایہ، مجاز مرسل کی سیکڑوں مثالیں میر انیس کے کلام میں ملتی ہیں۔ صاحب تاریخ ادب اُردو نے ایک جگہ اس سلسلہ میں بڑی اچھی بات لکھی ہے۔

"میر انیس تمثیلوں، استعاروں اور صنائع و بدائع میں کمال رکھتے ہیں، وہ فضول مبالغے اور بیجا اغراق کو ہرگز پسند نہیں کرتے، جن کی اس زمانہ میں کثرت تھی مگر زمانہ کے ہاتھوں مجبور ہو کر انھوں نے مبالغہ، اغراق و غلو میں بھی کمال حاصل کیا، صنائع بدائع کا استعمال اس خوبی سے کرتے ہیں کہ جس سے شعر پر کوئی بار نہیں پڑتا اور حسن بڑھ جاتا ہے۔ اسی طرح ان کی تمثیلیں بھی نہایت حسین اور بہت ارفع اور نہایت آسانی سے سمجھ میں آنے والی ہیں وہ ان سے ایک عجیب دلکش اثر پیدا کرتے ہیں۔ بڑی چیز کی مثال ہمیشہ بڑی چیز سے دیتے ہیں، ان کی تشبیہات کبھی معمولی اور ادنیٰ قسم کی نہیں ہوتیں۔ کلام حسب موقع کہیں صاف و سلیس اور کہیں رنگین ہوتا ہے مگر فصاحت اور زور کہیں ہاتھ سے نہیں جاتا، بیان میں روانی غضب کی ہوتی ہے۔ فصاحت، نشست الفاظ، اور زور یہ سب ان کے کلام میں ملے ہوئے ہیں"۔ بقول ڈاکٹر رام بابو سکسینہ صاحب تاریخ ادب اُردو۔ "انیس کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس زمانہ میں جب تصنع اور تکلف اور مبالغے اور اغراق کا بازار گرم تھا، ان کی شاعری جذبات حقیقی کا آئینہ تھی۔"[۵۱]

---

[۵۱] تاریخ ادب اُردو۔ ڈاکٹر رام بابو سکسینہ۔

کلام انیسؔ پر اعتراضات اور اُن کی حقیقت

میر انیس کا زمانہ "عروسِ سخن" کے حسن و جمال اور محبوبی و رعنائی میں زیادہ سے زیادہ دلکشی پیدا کرنے کا زمانہ تھا، ہر شاعر اور ادیب اس بات کی کوشش کرتا تھا کہ وہ بہتر سے بہتر کلام پیش کرے۔ ایک ایک لفظ پر گرفت ہوتی تھی، لکھنؤ کے وزرار بھی مذاق شاعری سے آشنا تھے، مشاعروں اور ادبی محفلوں میں "نقادانِ سخن" علی الاعلان، ٹوک دیتے، اس خوف سے ہر شاعر اپنے کلام پر سنانے سے پہلے، کافی غور و خوض کر لیا کرتا تھا اور اساتذہ سے اصلاح بھی لیا کرتا تھا، ان نکتہ چینیوں کا فائدہ یہ ضرور ہوا کہ الفاظ کی تراش خراش اتنی زیادہ کی گئی کہ وہ خوب منجھ گئی۔ میر انیس کے زمانہ سے پہلے آتشؔ: ناسخؔ کا دور تھا۔ ناسخ نے "اصلاحِ زبان" کا بیڑا اُٹھایا تھا، انھوں نے اردو زبان سے بہت سے ایسے الفاظ خارج کر دیے جو ذوقِ سلیم پر گراں گزرتے تھے، الفاظ کی فصاحت و سلاست کی طرف زیادہ توجہ کی، روزمرّہ اور محاورہ صحیح استعمال کرنے پر زور دیا۔ الفاظ وہی قابل قبول سمجھے گئے، جن کے بولنے سے حلق کے آپریشن کرانے کی ضرورت نہ ہو، البتہ اُن سے یہ اجتہادی غلطی ضرور ہوئی کہ انھوں نے زیادہ تر وہی الفاظ اُردو میں استعمال کئے جو عربی یا فارسی کے تھے، اُردو کے فطری چشمے سے آبیاری کی کوشش کم کیا بالکل نہیں کی۔ ہندی کے مستعمل الفاظ کو قریب قریب متروک قرار دیا اور ان کے بجائے عربی یا فارسی کے الفاظ استعمال کئے۔ ناسخ کے بعد ان کے شاگردوں اور لکھنؤ اسکول کے حضرات نے اس "تطہیر و تنسیخ" کا کام جاری رکھا۔ یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ "عمل ناسخ" کے اغراض و مقاصد زیادہ تر غزلوں کی اصلاح سے

وابستہ تھے اور وہی سب سے زیادہ اس سے متاثر بھی ہوئی۔ غزل کے علاوہ دوسرے "اصنافِ سخن" یعنی قصیدہ، مثنوی، مرثیہ وغیرہ اس سے بہت کم متاثر ہوئے خصوصاً مرثیہ نگاروں نے "ناسخی زبان" کی پابندی نہیں کی۔ ہو بھی نہیں سکتی تھی، مرثیہ کو انیس اور دبیر نے جس قدر وسعت دے دی تھی، اس کے لئے یہ ناگزیر تھا کہ ہر قسم کے الفاظ استعمال کئے جائیں۔ پھر میر انیس تو خود "اہل زبان" ہی نہیں بلکہ صاحب زبان تھے۔ ان کا ورثہ اور ماحول دونوں "زبان داں" تھا۔ ناسخی اصول و قواعد کی پابندی کو وہ زبان کی ترویج و ترقی کے لئے اچھا نہیں سمجھتے تھے اسی لئے انھوں نے ہمیشہ اپنی زبان پر فخر کیا ہے

"مشاعروں یا ادبی محفلوں میں عموماً اسی پس منظر میں گرفت ہوتی تھی، جہاں کسی ترکیب یا الفاظ کی بندش میں خامی ہوئی کہ فوراً بھرے مجمع میں طنز آمیز تعریف کی جانے لگی۔ ایک مرتبہ میر انیس کسی محفل میں مرثیہ پڑھ رہے تھے جب یہ مصرع پڑھا کہ۔

"جس طرح کہ نغمے کی صدا ساز پہ دوڑے"

فوراً ایک گوشے سے آواز آئی: "اے حضور کیا خوب فرمایا ہے" پہ دوڑے " پھر زحمت فرمایئے۔ غرض انیس کے کلام پر اعتراضات اسی قسم کے ہیں، میں یہ نہیں کہتا کہ ان کا کلام "بے عیب" ہے اور اس میں کسی قسم کا کوئی سقم نہیں ہے کہہ بھی کیسے سکتا ہوں لاکھوں اشعار کے خرمن میں اگر ہزار پانسو دانوں میں کوئی خرابی ہو تعجب کی کون سی بات ہے، مور کے پیروں کو دیکھ کر اس کی خوبصورتی سے کون عقلمند انکار کر سکتا ہے؟ میر انیس کے کلام کا یہی حال ہے"[1] ایک تو ان کے حریف مقابل مرزا دبیر تھے جن کی قابلیت و صلاحیت و قابلیت مسلم تھی اور جنھیں مرثیہ گوئی میں وہی کمال حاصل تھا جو میر انیس کو تھا۔ پھر ان بزرگوں کے شاگردان رشید "انیسئے اور دبیریے" اپنے اپنے استاد کا کمال ثابت کرنے کے لئے زمین آسمان کے قلابے

---

[1] اردو شاعری میں مرثیہ کا مقام۔ مشیر احمد علوی۔ امیر محل کاکوری لکھنؤ۔

ملا دیتے تھے، اس میں ایک دوسرے کی تضحیک و تذلیل بھی ہوجاتی تھی، زباندانی کے یہ معرکے مسلسل ہوتے رہتے تھے، بعض ایسی ادبی محفلیں قائم تھیں، جن میں صرف کلام پر اعتراضات کئے جاتے تھے۔ اس محفل میں شریک ہونے کی شرط یہی تھی کہ کوئی شخص اپنے کلام پر اعتراضات کو برا نہیں ماننے گا۔ اس سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ نکتہ چینی کرنے اور سننے کی باقاعدہ تربیت ہونے لگی اور اپنے کلام کو درست کرنے کا جذبہ عام ہو گیا۔ میرانیس کی شاعری پر جو اعتراضات کئے گئے ان میں معنوی نقائص کے بجائے زبان کی خامیاں اور قافیہ و عروض کی غلطیاں دکھائی گئیں۔ سب سے پہلے عبدالغفور خاں نسّاخ نے باقاعدہ انیس و دبیر کے کلام پر اعتراضات کئے۔ ان کا اعتراض کرنا تھا کہ جواب و ردّالجواب کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو گیا۔ اس سلسلہ میں کئی تذکرے مثلاً 'سنان دلخراش، جلوۂ نیرنگ، تقلید الاوساخ' وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ان تذکروں میں کسی حد تک غیر جانبداری سے کام لیا گیا، اگرچہ زبان و انداز بیان کہیں کہیں ادب اور تہذیب سے گرا ہوا ہے تاہم یہ ان معرکوں سے جو 'انیسیوں' اور 'دبیریوں' میں ہوتے رہتے تھے بہت غنیمت ہیں۔ میرانیس کے اعتراضات کو ذیل کی باتوں کو مدنظر رکھ کر پڑھنا چاہیے۔

۱۔ میرانیس نے ۷۲ برس کی عمر پائی، اس طویل زمانہ میں ادب میں کافی انقلابات ہوئے، آزادی کی جنگ سے پہلے کا ادب اور آزادی کی جنگ کے بعد کا ادب، ایک دوسرے سے مختلف تھا۔ شعر و ادب کا نظریہ بدل چکا تھا یا بدلتا جا رہا تھا۔

۲۔ میرانیس خود 'اہل زبان نہیں بلکہ صاحب زبان' تھے، ان کے گھر کی زبان حوض کوثر سے دھلی ہوئی اور ٹکسالی زبان تھی، روزمرّہ اور محاورہ کے بادشاہ تھے۔

۳۔ شیخ ناسخ نے زبان میں جو اصلاح کی تھی میرانیس اس کی پابندی نہیں کرتے تھے

۴۔ میر انیس کے کلام کے کئی دور کئے جا سکتے ہیں۔ ابتدائی دور کے کلام میں جو نقائص تھے وہ آخری دور کے کلام میں نہیں رہے، ادوار کے اعتبار سے نظم طباطبائی نے میر انیس کے مرثیوں کی ترتیب تین جلدوں میں کی ہے۔ پہلی جلد میں دور آخر کا کلام ہے دوسری جلد میں اس سے پہلے کا اور تیسری جلد میں اس سے پہلے کا، ان مرثیوں کو دیکھنے کے بعد بہت سے اعتراضات خود بخود ختم ہو جاتے ہیں۔

۵۔ میر انیس کے کلام میں الحاقی کلام کافی شامل ہو گیا ہے۔ جس کا انتخاب کرنا بےحد دشوار ہے۔ بہت سے مرثیوں میں اشعار اور متعدد بند شامل ہو گئے ہیں، مہذب لکھنوی اور پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب 'تطہیر کلام انیس' بڑی تحقیق و تفتیش سے کر رہے ہیں جس کا اشارہ گذشتہ صفحات میں کیا جا چکا ہے۔

۶۔ اردو کتابوں 'کاتبوں کی اصلاح' کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے اور شاید ہی کوئی مؤلف یا مصنف ان کی مہربانیوں سے بچا ہو۔ میر انیس کے کلام میں بھی انھوں نے کافی اصلاح کی، کلام کی مقبولیت نے غور کرنے کا موقع نہیں دیا، مرثیہ خوانی کے رواج نے، ان غلط الفاظ کے استعمال کو بھی، اتنا زبان زد خاص و عام کر دیا کہ آج بڑے بڑے نقادوں کو بھی یہ تمیز کرنا مشکل ہے کہ کون لفظ صحیح ہے کون غلط۔ مطبع نولکشور نے صحت کلام پر توجہ نہ کی۔

۷۔ میر انیس نے 'مرثیہ نگاری' اپنے لئے مخصوص کر لی تھی، اس صنف کو انھوں نے جو عروج بخشا وہ اردو کی کسی اور صنف کو نصیب نہ ہو سکا۔ مرثیہ کو اتنی وسعت دی کہ جملہ 'اصناف سخن' کی جھلک اس میں آگئی، اور سب سے بڑا کمال یہ کیا کہ 'رزمیہ شاعری' کی بنیاد ڈال کر اس کو دنیا کی بڑی سے بڑی رزمیہ نظموں کے برابر بلکہ بہتر کر دیا۔ نقادان سخن کے سامنے اردو میں اس قسم کی شاعری کا کوئی نمونہ نہیں تھا۔ اس لئے انھوں نے نافہمی میں بہت سے

اعتراضات کردیے۔

اب ہم مختصراً ان اعتراضات کا ذکر کرتے ہیں جن کو علامہ شبلی نے اپنے موازنہ میں ذکر کیا ہے، عبدالغفور خاں نساخ نے جو اعتراضات کئے ہیں یہاں ان کا اختصار پیش کیا جاتا ہے۔

قافیہ پر اعتراض ۱۔ دانا اور بینا کا قافیہ، سینہ، مدینہ اور قرینہ کے ساتھ باندھا ہے جو جائز نہیں جیسے۔

حق نما ہے تو جہاں میں سے یہی آئینہ — اس کا عاشق ہو تو ہوں کور کی آنکھیں بینا

لیکن علامہ شبلی نے اس قافیہ کو جائز سمجھا ہے، اور قافیہ کی یہ پابندی اردو شاعری کیلئے نقصان دہ ہے۔ خود میر انیس بھی اس کو جائز سمجھتے تھے۔

۲۔ شائگان قافیہ میر انیس نے شائگان قافیہ بھی باندھے ہیں جیسے اس بند میں۔

ناگاہ بڑھی فوج ہوا جنگ کا ساماں — اور گھٹنے لگی طاقتِ جسمِ شہِ مرداں

شہزادے پہ جب پڑنے لگا تیر کا باراں — تلوار علم کرکے کہا یا شہِ مرداں

شہِ مرداں، شائگاں، ہے لیکن اس کی تاویل یہ ہے کہ پہلے بند میں شہِ مرداں سے مطلب خود حضرت امام حسین علیہ السلام اور دوسرے بند میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ ہیں۔

عروضی غلطیاں اکثر جگہ حروف تقطیع میں گر جاتے ہیں۔

ع — رانڈ ہوتی ہے اک رات کی بیاہی ہوئی دختر

ع — باہیں جو گلے میں تھیں تو بند دیدۂ خونبار

کتابت کی غلطیاں میر انیس کے بہت سے اشعار ایسے ہیں جن پر کاتبوں نے کرم فرمائی کی ہے۔ رفتہ رفتہ یہی اشعار زبان زد خاص و عام ہو گئے۔

ع۔ ناگاہ بجا فوج عدو میں طبل جنگ۔ میں طبل کے بجائے دہل تھا

ع۔ ہو مغفرت خلیق کی یا رب ذوالکرام۔ میں ذوالکرام کے بجائے خالق انام تھا۔

ع۔ انتہا یہ سخن کہہ کے وہ کونین کا عالی۔ میں عالی کے بجائے والی تھا۔

روزمرہ اور محاورہ کا غلط استعمال | میرانیس کے کلام پر ایک اعتراض یہ بھی ہے کہ انھوں نے غلط محاورے اور روزمرے استعمال کئے۔ اس اعتراض کی اصلیت صرف اتنی ہے کہ میرانیس نے مستعمل روزمرہ یا محاورہ کو استعمال کرنا ٹھیک سمجھا اور ایسے محاورے جو بعد میں متروک ہو گئے وہ بعد میں بھی استعمال کرتے رہے۔ جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے کہ خود میرانیس اپنے گھر کی زبان پر فخر کرتے تھے اور اسی کو سند سمجھتے تھے۔ لہٰذا وہ لکھنؤ کی مصنوعی تراش خراش کو ناپسند کرتے تھے۔ تاہم انھوں نے بعض ایسی غلطیاں کی ہیں جن کے لئے کوئی عذر قابل قبول نہیں ہو سکتا۔

الفاظ کا غلط استعمال | حصول بجائے حاصل ع جو خوبیاں کہ چاہئیں وہ سب حصول ہیں۔

واجبات بجائے واجبات سے یا واجب ع مت روکنا ہے خاطر مہمان واجبات

خوشی بجائے خوشس ع اس مژدہ کو سنتے ہی خوشی ہو گئی شیر میں

صفا کر دیا بجائے صاف کر دیا۔ ع بت توڑ کے کعبہ کو صفا کر دیا کس نے؟

معنوی غلطیاں | لفظی غلطیوں کے علاوہ معنوی غلطیوں سے بھی میرانیس کا کلام پاک نہیں ہے۔ جیسے

مصرعوں میں بے ربطی | ایک مصرع نہایت بلند و پاکیزہ دوسرا مصرعہ محض بھرتی کا تھا۔

سر ہر کہیں ہوتے ہیں سخی سے دنی کہیں بوڑی کہیں تھی زائد کہیں تھی ائی کہیں

خواباں تھے زیب گلشن زہرا جو آب کے شبنم نے بھر دیے تھے کٹورے گلاب کے

ہر بات میں شکست، ظفر نیک ہات میں ہات اُڑ کے جا پڑا کئی ہات ایک ہات میں

لفظی رعایت کی پابندی سے کلام میں سقم

ع بولے نہنگ خوب نہیں یہ اگر مگر

سایہ کنویں میں اترا تھا پانی کی چاہ سے

پانوں یہ وہ ہیں کہ ان پانوں کو جو ہاتھ لگائے تو سردست سرافرازی کونین کو پائے

یہ صدا سنتے ہی خود رک گیا قرنا کا خروش تھم گیا طبل وغا کی بھی وہ آواز کا جوش

ہو گیا جوڑ کے ہاتھوں کو جلاجل خاموش کیا بجاتے، کہ بجا تھے نہ کسی شخص کے ہوش

چھیڑنا ان کے سرودوں کا بھی ناساز ہوا

رعب فرزند نبیؐ سرمۂ آواز ہوا

پہلے تین مصرعوں سے کتنا رعب و دبدبہ اور جلال ظاہر ہوتا ہے۔ لیکن بجاتا، سرود ناساز کی ضلع جگت نے اس کو ختم کر دیا۔

اسی قسم کی متعدد مثالیں میر انیس سے کلام سے مل سکتی ہیں لیکن ان عیوب کے باوجود میر صاحب کے کلام پر حرف نہیں آتا ہے۔ کون شاعر ایسا ہے جسکا کلام بے عیب ہو، میر و سودا ہی کو لے لیجئے دیکھئے کتنے عیب نظر آنے لگتے ہیں۔ کسی زبان کا بڑے سے بڑا شاعر بھی غلطیوں سے پاک نہیں ہو سکتا۔

تاریخی اعتراضات میر انیس کے مرثیوں پر ایک اعتراض یہ بہت وزنی ہے کہ انھوں نے واقعات کربلا کو اس قدر مبالغہ کے ساتھ بیان کیا کہ اس کی روحِ صداقت،

ختم ہو گئی۔ بعض روایات ایسی بیان کیں جن کا سرے سے کوئی وجود ہی نہیں۔ حضرت امام حسینؑ نیز ان کے اعوان و انصار، احباب و اعزّا کا کردار، پیش کرتے وقت اس امر کا خیال نہیں رکھا کہ وہ نہایت عالی مرتبہ، سچے خدا پرست تھے اور سچائی کے لئے اپنی اپنی قربانی پیش کر رہے تھے۔ مقابلہ کا انجام وہ جانتے تھے کہ شہادت کے سوا اور کچھ نہیں۔ لیکن شوق شہادت کا نشہ، دشمنوں کی فوج کے ظلم و ستم کی ترشیوں سے اترنے والا نہیں تھا، گویا وہ سب خود "تہِ تیغ" کے متمنی تھے، پھر مصائب و آلام اُن کے لئے صبر شکن کیسے ہو سکتے؟ میر انیسؔ نے سید الشہدا نیز ان کے اہلبیت اور حرم کی گریہ و زاری، سینہ کوبی کی جو تصویر کھینچی ہے اُس سے ایک صاحبِ ایمان و عمل کے قلب پر ٹھیس ضرور پہنچتی ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ شاعر کو واقعات سے کیا مطلب؟ اسے تو انداز بیان مطلب ہے یہ نہیں دیکھا جاتا کہ وہ کیا بیان کرتا ہے بلکہ دیکھنے کی چیز یہ ہوتی ہے کہ وہ کس طرح بیان کرتا ہے۔ اور کس طرح بیان، کرنے کی شرط، میر انیسؔ سے بڑھ کر اور کون پوری کر سکتا ہے، پھر مرثیہ کا مطلب بھی یہی تھا کہ سامعین گریہ و زاری، نالہ و شیون اور آہ و بکا زیادہ کریں۔

میر انیسؔ نے عرب کا کردار بھی ہندوستانی رکھا۔ وہ بھی لکھنؤ کے نازک مرد اور عورتوں کا کہ جن کے لئے معمولی تکلیف بھی پہاڑ ہوتی ہے۔ اس قسم کی سیکڑوں مثالیں مل سکتی ہیں۔ مذہبی یا تاریخی اعتبار سے یہ غلطیاں ضرور سنگین ہیں لیکن یہ بھولنا نہ چاہئے کہ میر انیسؔ شاعر تھے، مفتی، عالم، مورّخ ہونے کا انھوں نے دعویٰ کبھی نہیں کیا۔ انھوں نے جو کچھ لکھا شاعری کے نقطۂ نظر سے لکھا مرثیہ کے اثرات کے پیش نظر لکھا۔ اس لئے گو تاریخی، مذہبی یا روایتی اعتبار سے ان کے کلام میں نقائص موجود

ہوں تو ہوں لیکن صرف شاعری کے اعتبار سے اس قسم کے اعتراضات کی نہ کوئی اہمیت ہے، نہ افادیت، بقول پروفیسر محی الدین قادری زور ۔ "میر انیس اگر ہندوستانیوں کی نظروں کے آگے ایک عرب عورت کا مکمل نقشہ کھینچ دیتے تو ان کے کلام کو اس قدر مقبولیت حاصل نہ ہوتی کیونکہ ہندوستانی ان کی پیش کردہ ہستیوں کو اپنی ہی چیز نہ سمجھ کر ان سے غیریت برتتے اور یہ مغائرت انھیں ان ہمدردیوں اور اس پرخلوص محبت سے روکے رہتی جو آج میر انیس کے پڑھنے کے بعد حضرت زہرا، حضرت زینب وغیرہ کے متعلق دلوں میں خود بخود پیدا ہو جاتی ہے۔ اس لئے میر انیس نے جن نسائی سیرتوں کو پیش کیا ہے ان میں ایک حد معینہ تک ہندوستانی فطرت کو بھی شامل کرلیا ہے۔"

ڈاکٹر ابواللیث صدیقی بدایونی نے لکھنؤ کے دبستان شاعری میں کلام انیس کے متعلق ...ور پر حسب ذیل نتائج اخذ کئے ہیں جن کو مختصراً ذکر کرتے ہیں۔

(۱) انیس نے مرثیہ کی صورت یا اسلوب میں کوئی بین اصلاح یا اضافہ نہیں کیا (مثلاً بعد میں ساقی نامہ مرثیہ کے شروع میں لکھا گیا) اس سلسلہ میں مرثیہ متقدمین میں سودا کا اور انیس سے پہلے ضمیر کا اور بعد تعشق کا خاص احسان ہے میر انیس خود اسی راستہ پر گامزن ہوئے جو خلیق اور ضمیر نے تیار کیا تھا۔

(۲) باوجود کردار نگاری کے کمال کے جو ان کے مراثی میں جا بجا ملتا ہے ۔ انھوں نے متقدمین مرثیہ نگاروں کی طرح یہ سمجھنے میں غلطی کی کہ یہ کردار نگاری کا سب سے بڑا عیب ہے کہ افراد مرثیہ جو عربی نژاد ہیں اور عربی ماحول میں چلتے پھرتے ہیں ان کی تصویروں میں ہندوستانی تہذیب و معاشرت کا رنگ بھر دیا ہے ۔ اس سلسلہ میں

ڈاکٹر زور کی رائے پیش کی جا چکی ہے)

۳۔ میر انیس بعض رسمی مضامین ادا کرنے میں عام مرثیہ گویوں کی طرح ناقابلِ یقین باتوں کو نظم کر جاتے ہیں مثلاً حضرت قاسم کی شادی کا واقعہ۔

۴۔ انیس کے کلام کو پڑھ کر یہ تو محسوس ہوتا ہے کہ وہ رولاتے ہیں لیکن اس میں شبہہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ خود بھی روتے ہیں۔

ان اعتراضات کے بعد ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں کہ

(۱) انیس کے کلام پر فنی نقطہ نظر سے نکتہ چینی یا ضمیر و خلیق کے کلام کا انیس کے کلام کا ہم پلّہ ہونا۔ یا انیس کا عرب اور ہندوستانی کرداروں کو خلط ملط کر دینا یا بعض ساقط الاعتبار روایتوں کو پیش کرنا یا اسی قسم کے دوسرے اعتراضات انیس کے شاعرانہ کمالات کو بے نور نہیں کر سکتے۔" سچ ہے۔

"کہیں خاک ڈالے سے چھپتا ہے چاند"

اور

خورشید کو کچھ حاجتِ زیور نہیں زنہار پھولوں پہ کوئی عطر لگائے تو ہے بیکار
اعلیٰ ہے اگر جنس تو کیا حاجتِ اظہار خود مشک ہو خوشبو نہ کہ خوشبو کہے عطّار

جو بد ہے سو بد ہے، جو نکو ہے سو نکو ہے
چھپنے کی نہیں آپ اگر عود میں بُو ہے

میر انیس کے کلام کی حزنیہ، بزمیہ اور رزمیہ عطر بیزیاں 'دلدادگان اُردو کے دل و دماغ کو ہمیشہ معطر فرماتی رہیں گی، جس سے چمنِ نظم اُردو "رشک گلزار ارم" بنا رہے گا۔

توارد اور سرقات میر انیس ہی نہیں بلکہ قریب قریب ہر شاعر شعوری یا غیر شعوری طور پر دوسرے شعراء کے کلام سے استفادہ کرتے ہیں اور اس بات کی کوشش کرتے ہیں کہ جو مضمون ان شعراء نے باندھا ہے، اُس کو یہ زیادہ ندرت و جدت کے ساتھ ادا کریں، اس سے یہ تو ہوا کہ ایک رنگ کا مضمون، سو رنگ سے باندھا گیا اور کبھی کبھی اس میں ندرت و اضافہ بھی ہوا۔ مگر زیادہ تر یہی ہوا کہ ایک دوسرے کا کلام لفظ بہ لفظ مل گیا، کبھی کچھ تغیر و تبدل کے ساتھ، اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ اکثر دو شاعروں کے خیالات ایک سے ہوتے ہیں اور جب وہ اس کو شعر یا مصرعہ کا جامہ پہناتے ہیں تو قریب قریب یا بالکل مل جاتے ہیں؛ توارد اسی کا نام ہے اور سرقہ کسی شاعر کے مضمون کو بعینہٖ یا خفیف تغیر کے ساتھ دانستہ ادا کرنے کو کہتے ہیں۔ میر انیس جیسے باکمال شاعر پر سرقہ کا الزام لگانا، تو کسی طرح مناسب نہیں ہے، البتہ توارد ضرور ہو سکتا ہے، میر انیس کے پیشتر مرثیہ گویوں نے جن خیالات کا اظہار کیا تھا، میر انیس نے ان کو پیش نظر رکھ کر اپنے انداز بیان سے کہیں سے کہیں پہنچا دیا۔ جیسے میر ضمیر نے کہا تھا۔

حبت تک کہ ذوالفقار نے کاٹے نہ تین پر　　ہرگز نہ دم لیا پر روح الامین نے

انیس نے اس میں جدت پیدا کی۔

خیبر میں کیا گذر گئی روح الامین پر　　کاٹے ہیں کس کی تیغ دو پیکر نے تین پر

میر ضمیر نے نیزہ کی صفت اس طرح بیان کی۔

اک نیزہ ہوا پار وہ سو سو کے جگر سے　　رشتہ گزر ہوتا ہے جوں سلک گہر سے

میر انیس کا انداز بیان ملاحظہ ہو۔

ہوتا تھا پار آ کے وہ ہنگام دار و گیر　　سو دل سے مثل رشتۂ تسبیح ایک تیر

لیکن اکثر اشعار میں کوئی ترقی نہیں ہوئی، بلکہ کسی فارسی شعر کا بعینہٖ ترجمہ کر دیا ہے۔

بو علی سینا :۔ گردم ہمہ مشکلات عالم را حل ہر بند کشودہ شد مگر بند اجل

میر انیس :۔ عقدے سب حل ہوئے مگر آہ انیس یہ بند اجل کسی سے کھولا نہ گیا

نظامی :۔ سناں بر سناں رستہ چوں نوک خار سپر بر سپر بستہ چوں لالہ زار

انیس :۔ ہر سمت تھی سناں پہ سناں مثل خار زار ہر صف میں تھی سپر پہ سپر مثل لالہ زار

کاشی :۔ بودیم ہمہ چوں نافہ ہمہ عمر در خطا موئے سفید میں دو درون سیاہ ما

انیس :۔ نافہ کی طرح عمر خطا میں گذری بالوں پہ سفیدی ہے سیاہی دل میں

لیکن اس سے کون شاعر خالی ہے؟ اس کو ترجمہ کہا جائے یا سرقہ؟ اس کا فیصلہ آپ کے ذوق سلیم پر چھوڑا جاتا ہے۔

میر انیس اور مرزا دبیر

میر انیس کے کلام پر مختصر بحث کی جا چکی، انھوں نے مرثیہ گوئی میں جو معجز بیانیاں کیں اور جو شہرت و مقبولیت انھیں اپنے کلام کی بدولت نصیب ہوئی، اردو ادب کا ہر طالب علم اس سے بخوبی واقف ہے۔ میر انیس کے دور میں دوسرے مرثیہ گو شعرا بھی تھے، لیکن ایک مرزا دبیر کے علاوہ کسی کو، کوئی جانتا بھی نہیں۔ مرزا دبیر کے کلام میں ایسی خوبیاں اور خصوصیات ضرور ہیں جن کی بدولت، ان کو قریب قریب وہی عروج و کمال، وہی اعزاز و مرتبہ حاصل ہوا جو میر انیس کو تھا۔ میر انیس کی عمر ہی نہیں مرثیہ گوئی میں

گزری تھی بلکہ شبیر کی مدّاحی میں وہ پانچویں پشت میں تھے برخلاف اس کے مرزا دبیر کو شاعری ورثہ میں نہیں ملی تھی، ان کی مرثیہ گوئی 'اکتسابی' کہی جاتی ہے، لیکن میں اسے 'خداداد' سمجھتا ہوں۔ شاعر ہونے کے علاوہ علوم متداولہ میں بھی ماہر تھے اور عربی و فارسی کے منتہی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام میں عالمانہ وزن اور وقار پایا جاتا ہے۔ ان کی شاعری اور ان کے فضل و کمال نے مل کر انھیں انیس کے مدمقابل بنا دیا اور مرثیہ گوئی میں دونوں باکمالوں کا نام لازم و ملزوم سا ہو گیا ہے۔ اس لئے انیس کے کلام پر روشنی ڈالتے ہوئے اگر مرزا دبیر کا ذکر نہ کیا جائے تو ایک بہت بڑی کمی رہ جائے گی۔ آئندہ اوراق میں مرزا دبیر کے کلام کی خصوصیات و اولیات پر اجمالی روشنی ڈالنے کے بعد، میر انیس اور مرزا دبیر کے کلام کا موازنہ کیا جائیگا اور ان کے متحد المضمون اشعار کو پیش کیا جائے گا[۱]

خصوصیات و اوّلیات مرزا دبیر ۱۔ مرزا دبیر نے میر انیس سے پہلے مرثیہ گوئی شروع کی تھی، میر ضمیر لکھنؤ ہی میں تھے، وہ اپنے شاگرد رشید یعنی مرزا دبیر کو مرثیہ گوئی کی تعلیم و تربیت انتہائی توجہ اور محنت کے ساتھ اس لئے کرتے تھے کہ انھیں مرزا دبیر میں صلاحیت زیادہ نظر آئی اور انھیں امید تھی کہ ایک دن ایسا ضرور آئے گا جب مرزا دبیر کا شہرہ مرثیہ میں ہو کے رہے گا۔ میر انیس اس وقت تک فیض آباد میں تھے، اور گوشۂ گمنامی میں تھے۔ لکھنؤ میں انیس کو کوئی جانتا بھی نہ تھا۔

۲۔ مرزا دبیر میر انیس سے زیادہ صاحب علم و فضل و کمال تھے، انھوں نے مرزا غالب کی طرح شعر و شاعری کو علم و فن کی سنجیدگی بخشی۔

---

[۱] اردو شاعری کی مذہبی تاریخ۔ مولوی سراج الحق مچھلی شہری اور مولانا اصغر حسین انصر گونڈوی

۳۔ مرزا دبیر کی زبان زیادہ پُر شکوہ ہے، انھوں نے گریہ و بکا کے لئے، جو زبان اور انداز بیان اختیار کیا، وہ عام پسند نہیں تھا بلکہ خاص پسند تھا اس لئے ان کا حلقۂ اثر اعلیٰ طبقہ میں زیادہ تھا۔

۴۔ مضمون آفرینی، مبالغہ اور تخیل کی بلندی میں ان کا کوئی جواب نہیں۔ معنی آفرینی میں وہ خاص توجہ کرتے تھے اس لئے طرح طرح کے خیالات، نئے انداز اور مناسب الفاظ میں ادا کرتے تھے انھوں نے سیکڑوں نئی تشبیہیں اور استعارے استعمال کئے۔ زبان کی صفائی، بندش کی چستی اور شعر کے ظاہری محاسن پر وہ کافی غور کرتے تھے۔

۵۔ حقیقت نگاری، جذبات نگاری اور جوش اُن کے کلام کا خاصہ ہے۔

۶۔ محض صنعت گری اور رعایت لفظی سے انھوں نے حتی الوسع پرہیز کیا ہے اور رکیک مبتذل الفاظ کو بہت کم استعمال کیا ہے البتہ کہیں کہیں عربی کے غیر مستعمل الفاظ کلام میں آجانے کی وجہ سے غرابت پیدا ہو جاتی ہے۔ مولانا شبلی نے انیس و دبیر پر بحث کرتے ہوئے مرزا دبیر کے متعلق تحریر فرمایا ہے۔ "مختصر یہ کہ خیال آفرینی، دقت پسندی، جدت استعارات، اختراع تشبیہات، شاعرانہ استدلال، شدت مبالغہ میں ان کا جواب نہیں لیکن اس زور کو وہ سنبھال نہیں سکے۔ اس وجہ سے کہیں خامی پیدا ہو جاتی ہے۔ کہیں تعقید اور اغلاق ہو جاتا ہے۔ تشبیہات کہیں پھبتیاں بن جاتی ہیں اور کہیں محض فرضی خیال رہ جاتی ہیں۔ تاہم اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ جہاں ان کا کلام فصاحت و بلاغت کے معیار پر بھی پورا اُتر جاتا ہے نہایت بلند رتبہ ہو جاتا ہے۔"

مرزا دبیر بہت پرگو تھے، ان کا کلام بیس جلدوں میں شائع ہوا ہے، غیر مطبوعہ کلام بھی موجود ہے۔ اگر اس چمنستان شاعری میں کچھ خار ہوں اور چند شعر یا بند قابل گرفت ہوں تو ان کو انیس سے کمتر کیسے کہا جا سکتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ دونو باکمالوں کا رنگ علحدہ علحدہ اور اپنے رنگ کے دونوں شہنشاہ ہیں۔

انیس و دبیر کا تقابل میر انیس اور مرزا دبیر کی شاعری اور میلانات کا جائزہ لئے جانے پر حسب ذیل نتیجہ نکلتا ہے۔

۱۔ میر انیس کی شاعری، دہلوی رنگ کی شاعری ہے اور مرزا دبیر کا کلام لکھنوی رنگ میں ہے۔

۲۔ انیس مضمون آفرینی کے بجائے اثر آفرینی پر زور دیتے ہیں، جذبات نگاری میں انھیں کمال حاصل ہے، مرزا دبیر اپنی علمیت، اپنے ماحول کے زیر اثر مضمون آفرینی اور باریک بینی پر زور دیتے ہیں۔

۳۔ میر انیس کے کلام میں سادگی، اصلیت اور جوش ہے وہ ہر بات سیدھے سادے پیرایے میں بے تکلف بیان کرتے جاتے ہیں، اسی لئے سامعین پر ان کے کلام کا زیادہ سے زیادہ اثر پڑتا ہے، مرزا دبیر نے پُر تکلف انداز اختیار کیا، انھوں نے اظہار فن پر زیادہ زور دیا، صنائع بدائع کا التزام، مضمون آفرینی و باریک بینی، تخیل کی بلندی، بعید از قیاس مبالغہ اور تشبیہ، مرزا دبیر کے کلام کا زیور ہیں، جس نے اصلی حسن کو ختم کر دیا۔ ان کی دقت پسندی نے ہمیں ایک مخصوص حلقے تک محدود رکھا، مرزا دبیر کے رنگ پر چلنے والے نہ ہونے کے برابر ہیں لیکن میر انیس کے نقش قدم پر چلنے کی ہر ایک نے کوشش کی۔[1]

---

[1] اردو ادب میں مرثیہ کا مقام۔ ناظر کاکوروی ۲۰۲ حسن منزل الہ آباد

صاحب یادگار انیس تحریر فرماتے ہیں ۔

"دونوں استادوں کی روش جداگانہ ہے ۔ میر انیس کا کلام فصیح اور شیریں ہے اور مرزا دبیر کا دقیق و ملیح ۔ شیرینی اور نمک دونوں کی بنی آدم کو احتیاج ہے اور ایک کو دوسرے پر مِنْ کُلِّ الْوُجُوْہ ترجیح نہیں دی جا سکتی ۔ البتہ میر انیس کو مرزا صاحب پر یہ فوقیت حاصل ہے کہ ان کے کلام کی تاثیر اور تازگی عرصہ تک زندہ رہے گی اور مرزا دبیر کی شوکت الفاظ و بلند پروازی مٹ جائے گی ۔ مرزا دبیر نے جو صنائع بدائع اپنے کلام معجز نظام میں صرف کئے ان کے سمجھنے والے بہت کم باقی ہیں اور مشرقی علوم سے بے توجہی کا یہی عالم رہا تو چند ہی روز میں شاید کوئی شخص ان صنائع سے لطف اٹھانے والا ہندوستان میں تلاش کرنے سے بھی نہ ملے گا بقول بیگم زاہدہ اسمٰعیل" اس رائے میں اتنا اضافہ اور کیا جا سکتا ہے کہ مشرقی علوم کو کون کہے اب اردو کا یہ حال ہے کہ وہ آزادی کے بعد قابل گردن زدنی قرار دی گئی، اس کی تعلیم یکلخت بند کر دی گئی ، اسکولوں، کالجوں، مدرسوں سب جگہ سے اس کو نکال دیا گیا ، پڑھانے والے ختم کر دئے گئے، یہ سب کچھ عین جمہوریت کے نام پر ہوا ۔ جب یہ عالم ہے تو کچھ دنوں کے بعد اردو کا نام لینے والا بھی کوئی نہ رہے گا ، موجودہ نسل جو کچھ تھوڑی بہت اردو جانتی ہے جانتی ہے، آئندہ نسل اردو سے بالکل ناواقف ہوگی ، اس وقت میر انیس ہی نہیں دوسرے تمام شعراء کے کلام کا کیا حشر ہوگا ؟ اس کا خیال ہی حوصلہ شکن ہے ۔"

میر انیس اور مرزا دبیر کے زمانے میں دونوں بزرگوں کے معتقدین اپنے اپنے استادوں کی تعریف خوب بڑھا چڑھا کر کرتے تھے ، یہ ادبی مکالمے ہنگاموں کی شکل

اختیار کر لیتے تھے، انیسیوں اور دبیریوں کا میدان کارزار گرم ہو جاتا تھا۔
بقول سالک دہلوی۔

"ایک طرف کا معتقد دوسری طرف والوں میں ایسا دیکھا جاتا تھا جیسے موحدین میں مشرک اور مسلمان میں کافر۔"

میاں مشیر جو مرزا دبیر کے شاگرد تھے کیا خوب کہا ہے۔

جھگڑا بکر کا ہے نہ جناب امیر کا　　اب قصہ رہ گیا ہے انیس و دبیر کا

لکھنؤ کے گلی کوچے دونوں باکمالوں سے گونج رہے تھے، ایک ہی مضمون کے بند اور مرثیے پڑھے جاتے اور ترجیح کے دلائل پیش کئے جاتے۔ ہم یہاں دونوں باکمالوں کے متحد المضمون اشعار، رباعیات اور مرثیوں کے چند بند پیش کرتے ہیں، جن سے یہ اندازہ بخوبی ہو جائے گا کہ میر انیس اور مرزا دبیر کے کلام میں کیا خاص فرق ہے۔ دونوں کس طرح ایک ہی خیال کو ادا کرتے ہیں، دونوں کس طرح کی تشبیہیں اور استعارے استعمال کرتے ہیں، دونوں کو اپنے اپنے رنگ میں کہنے کا کتنا کمال حاصل ہے۔

متحد المضمون اشعار

گرمی کی شدّت

انیس	دبیر
پانی تھا آب گرمی روزِ حساب تھی	مثل تنور گرم تھا پانی میں ہر حباب
ماہی جو سیخ موج تک آئی کباب تھی	ہوتی تھیں سیخ موج پہ مرغابیاں کباب

حضرت امام حسینؑ کا فخر

دبیر	انیس
چاہوں تو بیٹھے بیٹھے اک انگلی سے زین پر	طاقت اگر دکھاؤں رسالتمآبؐ کی
گردوں کی ڈھال چیر کے رکھدوں زمین پر	رکھ دوں زمیں پہ چیر کے ڈھال آفتاب کی

میدانِ جنگ میں موت کی فراوانی

یوں جسم رعشہ دار سے جانیں ہوئیں رواں	یوں روح کے طائر تن دسر چھوڑ کے بھاگے
جیسے مکاں سے زلزلہ میں صاحبِ مکاں	جیسے کوئی بھونچال میں گھر چھوڑ کے بھاگے

تلوار کی تیز رفتاری

کس آب وتاب سے یہ سرِ فوج پڑ گئی	سب نشئہ غرور جوانی اُتر گیا
پانی کا گھونٹ بن کے گلے سے اُتر گئی	تلوار تھی کہ حلق سے پانی اُتر گیا

اہل حرم ایک ہی رسن سے باندھے گئے ہیں، دونوں باکمالوں نے تشبیہ بامدہ نہایت مناسب انداز سے استعمال کیا لیکن میر صاحب کی بات ہی دوسری ہے۔

یوں متصل رسن سے بندھے تھے دلفگار	گردنیں بارہ اسیروں کی ہیں اور ایک رسن
رشتہ میں جیسے دانۂ تسبیح آبدار	جس طرح رشتۂ گلدستہ میں گلہائے چمن

حضرت امام حسینؑ کے اعوان و انصار بعد نماز، جنگ کے لئے آمادہ ہوتے ہیں۔

رو کش خدا کی فوج سے چھوٹے بڑے ہوئے	تیار جان دینے پہ چھوٹے بڑے ہوئے
سجادہ سے امام زمن اُٹھ کھڑے ہوئے	تلواریں ٹیک ٹیک کے سب اُٹھ کھڑے ہوئے

اس شعر میں دونوں باکمالوں نے فخر کے ساتھ زمانہ کی ناقدری کی شکایت کی ہے۔

انیسؔ
عالم ہے مکدر کوئی دل صاف نہیں ہے ۔ دل صاف ہو کس طرح کہ انصاف نہیں ہے

اس عہد میں سب کچھ ہے پر انصاف نہیں ہے ۔ انصاف ہو کس طرح کہ دل صاف نہیں ہے

اسی طرح سیکڑوں بلکہ ہزاروں اشعار متحد المضمون ہیں، ان اشعار کو پڑھنے کے بعد اس کا اندازہ ہوجاتا ہے کہ میر انیسؔ جس خیال کو نہایت سلاست و روانی کے ساتھ ادا کرتے تھے، مرزا دبیر اس کو اس خوبی کے ساتھ نہیں ادا کر پاتے تھے، انکا انداز بالکل علیحدہ ہے۔

متحد المضمون رباعیات

میر انیسؔ کی رباعیوں کا انتخاب لکھا جا چکا ہے، مرثیہ گویوں نے رباعیوں میں ہر قسم کے اخلاقی خیالات ادا کئے، رباعیوں کے مضمون قریب قریب یکساں ادا ہوتے تھے، ہر مرثیہ گو نے اپنے اپنے طرز بیان کو ادا کیا ہے، یہاں میر انیسؔ اور مرزا دبیر کی صرف چند متحد المضمون رباعیاں لکھی جاتی ہیں۔

دنیا بے حقیقت ہے

انیسؔ

راحت کا مزہ عدو کے جانی نکلا
دل سے نہ کبھی غم نہانی نکلا
پیاسے رہے آکے چاہ دنیا پہ انیسؔ
نکلا بھی کبھی تو شور پانی نکلا

دبیر

کھانے کا مزہ فقط زبانی نکلا
باقی سامانِ عیش فانی نکلا
چاہا تھا کہ ہاتھ دھوئیں دنیا سے دبیر
اتنا بھی نہ اس کنوئیں سے پانی نکلا

سفر آخرت

انیس

اب خواب سے چونک وقت بیداری ہے
لے زاد سفر کوچ کی تیاری ہے
مر مر کے پہنچتے ہیں مسافر یاں تک
یہ قبر کی منزل بھی غضب بھاری ہے

دبیر

آج آئے ہیں کل کوچ کی تیاری ہے
غفلت میں کٹی عمر یہ ہشیاری ہے
دنیا ہے عجب مقام حیرت نہ کھلا
یہ عالم خواب ہے کہ بیداری ہے

فکر مابعد الموت

درد و الم ممات کیوں کر گزرے
یہ چند نفس حیات کیوں کر گزرے
پیری میں بھی دوپہر ڈھلی شکر انیس
اب دیکھیں لحد کی رات کیوں کر گزرے

برزخ کی صعوبات کٹے گی کیونکر
تنہائی میں اوقات کٹے گی کیونکر
غفلت میں دبیر صبح پیری ہوئی شام
دن رات ہوا، رات کٹے گی کیونکر

قبر

آغوش لحد میں جب کہ سونا ہوگا
جز خاک نہ تکیہ نہ بچھونا ہوگا
تنہائی میں آہ کون ہووے گا انیس
ہم ہوئیں گے اور قبر کا کونا ہوگا

اک دن پیوند خاک ہونا ہوگا
تنہا تنہا لحد میں سونا ہوگا
اس قبر کے پردے کا کھلا حال دبیر
جو اوڑھنا ہوگا وہ بچھونا ہوگا

آنسو

انیس

داغِ غمِ شہ سینے میں گل بوٹے ہیں
کیا کیا گہر بیش بہا لوٹے ہیں
مجلس میں ریا سے جو کہ روتے ہیں انیس
اشک ان کے بھی موتی ہیں مگر جھوٹے ہیں

دبیر

مجلس میں گل اشک عزا لوٹے ہیں
ثابت ہے دلا شیشۂ دل ٹوٹے ہیں
یاں اشک ریائی کا بھی ہے مول بہشت
موتی سچے ہیں جو ہری جھوٹے ہیں

خاکساری

انیس

دل کو مرے شغل غمگساری کا ہے
غفلت میں بھی طور ہوشیاری کا ہے
گردوں کو اگر ہے سرکشی کا غرّہ
ہم کو بھی غرور خاکساری کا ہے

دبیر

بندوں پہ کرم حضرت باری کا ہے
مقدور کسے شکر گزاری کا ہے
دی ہے جو خدا نے سرفرازی مجھ کو
ثمرہ یہ نہال خاکساری کا ہے

شاعرانہ خودستائی

گلہائے مضامیں کو کہاں بند کروں
خوشبو نہیں چھپنے کی کہاں بند کروں
میں باعثِ نغمہ سنجیِ بلبل ہوں
کھولے نہ کبھی منہ جو زباں بند کروں

شیرانِ مضامیں کو کہاں بند کروں
کیا طبع کا دریائے رواں بند کروں
خلّاق مضامیں تو سبھی ہیں لیکن
کھل جائے حقیقت جو زباں بند کروں

متحد المضمون مرثیے

میر انیس اور مرزا دبیر نے واقعہ کربلا کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے
اس میں متعدد موضوعات کا اضافہ کر کے' اس کو دوسرے اصناف سخن سے
کہیں زیادہ اہم اور مفید بنایا' سفر کی تیاری' صبح کا منظر' شام غریباں' دشت کربلا'
گرمی کی شدت' معرکہ حق و باطل' گھوڑے اور تلوار کی تعریف' سید الشہدا کی شہادت'
مظلوم قافلہ حسین کی اسیری و روانگی۔ یہ اور اسی قسم کے عنوانات کے تحت دونوں
بزرگوں نے اپنا اپنا کمال دکھایا ہے۔ اپنے اپنے رنگ کے دونوں استاد ہیں یہاں
چند بند نقل کئے جاتے ہیں۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی تعریف

میر انیس

حق نے کیا عطا یہ عطا ہل اتی کسے
حاصل ہوا ہے مرتبہ لا فتی کسے
کونین میں ملا شرف انما کسے
کہتی ہے خلق بادشہ قل کفیٰ کسے
دنیا میں کون منتظم کائنات ہے
کس کو کہا خدا نے کہ یہ میرا ہات ہے

مرزا دبیر

اہل عطا میں تاج سر ہل اتی ہیں یہ
اخیار لاف زن ہیں شہ لا فتی ہیں یہ
خورشید انور فلک انما ہیں یہ
کافی ہے یہ شرف کہ شہ قل کفی ہیں یہ
ممتاز گو خلیل رسولان دین ہیں
کاشف ہے لو کشف یہ زیادہ یقین ہیں

اعلیٰ اور ادنیٰ کا مقابلہ

انیس	دبیر
کچھ خار مغیلاں گل تر ہو نہیں جاتا	ساماں سے کوئی صاحب ایماں نہیں ہوتا
قلعی سے کچھ آئینہ قمر ہو نہیں جاتا	ہر اہل عصا موسی عمراں نہیں ہوتا
ہر قطرہ کا نا چیز گہر ہو نہیں جاتا	پہنے جو انگوٹھی وہ سلیماں نہیں ہوتا
مس پر جو ملمع ہو تو زر ہو نہیں جاتا	آئینہ گر اسکندر دوراں نہیں ہوتا
جس پاس عصا ہو اسے موسیٰ نہیں کہتے	لاکھ اوج ہو پشہ کا ہما ہو نہیں جاتا
ہر ہاتھ کو عاقل ید بیضا نہیں کہتے	بُت سجدہ کافر سے خدا ہو نہیں جاتا

حضرت امام حسین علیہ السلام جب اپنے اہل حرم کے ساتھ روانہ ہونے لگے تو حضرت صغریٰ بیمار تھیں، بیمار ہونے کی وجہ سے امام ہمام نے انھیں چھوڑ دیا۔ حضرت صغریٰ کا چلنے کے لئے اصرار کرنا اور امام علیہ السلام کا نیز دوسرے حضرات کا سمجھانا، اس درد انگیز واقعہ کو سب نے لکھا ہے، میر انیس اور مرزا دبیر نے بھی بڑے موثر پیرایہ میں یہ واقعہ لکھا ہے۔

حضرت صغریٰ کی آرزو اور چلنے کے لئے بیتابی

کیا خلق میں لوگو! کوئی ہوتا نہیں بیمار۔
ہے کون سی تقصیر کہ سب ہو گئے بیزار
صغریٰ نے کہا صاحبو کیا کہتے ہو گفتار
اک بات پکڑ لی کہ یہ بیمار ہے بیمار

زندہ ہوں پہ مردہ کی طرح ہو گئی دشوار — شاید کہ سفر ہی میں شفا دے مجھے غفار

کیوں بھاگتے ہیں سب مجھے ہے کونسا آزار — یاں کون خبر لے گا مری یہ در و دیوار

حیرت میں ہوں باعث مجھے کھلتا نہیں اس کا — اتنی بھی تو طاقت نہیں جو اٹھ کے کھڑی ہوں

وہ آنکھ چرا لیتا ہے سنکتی ہوں جس کا — اے لوگو! میں کیا آپ سے بیمار پڑی ہوں

حضرت علی اصغر کو دیکھ کر بیمار بہن کے جذبات اُمنڈ آتے ہیں، کمزور ہاتھ بلائیں لینے کے لئے اُٹھتے ہیں لیکن نقاہت کی وجہ سے کپکپا جاتے ہیں، حضرت صغریٰ کے دل پر ٹھیس لگتی ہے، اس موثر و دلگداز واقعہ کو دونوں بزرگوں نے بیان کیا۔

انیس

ماں بولی یہ کیا کہتی ہے صغریٰ ترے قرباں — گھبرا کے نہ اب تن سے نکل جائے مری جاں

بیکس مری بچی ترا اللہ نگہباں — صحت ہو تجھے یہ مری دعا ہے یہی ہر آں

کیا بھائی جدا بہنوں سے ہوتے نہیں بیٹا

کنبے کے لئے جان کو کھوتے نہیں بیٹا

میں صدقے گئی بس نہ کرو گریہ و زاری — اصغر مرا روتا ہے صدا سن کے تمہاری

وہ کانپتی ہاتھوں کو اٹھا کر یہ پکاری — آ مرے ننھے سے مسافر ترے واری

چھٹتی ہے یہ بیمار بہن جان گئے تم

اصغر مری آواز کو پہچان گئے تم

تم جاتے ہو اور ساتھ بہن جا نہیں سکتی — تپ ہے تمہیں چھاتی سے لپٹا نہیں سکتی

جو دل میں ہے سب پر وہ سخن لا نہیں سکتی — رکھ لوں تمہیں اماں کو بھی سمجھا نہیں سکتی

بیکس ہوں مرا کوئی مددگار نہیں ہے
تم ہو تو تمھیں طاقت گفتار نہیں ہے

دبیر

پردہ کو اُٹھا کر یہ کہا بانو نے رو رو کر　صدقے گئی ماں ایسی تو منہ سے نہ نکالو
سب جیتے ہیں بیکس نہ ابھی آپ کو سمجھو　شبیر ہو، دنیا ہو، ترا کنبہ ہو، تو ہو
کب میں نے کہا یہ نہیں اصغر ہے تمہارا
لو شوق سے دیکھو یہ برادر ہے تمہارا

پھر ہاتھوں پہ اصغر کو رکھا کر کے یہ زاری　لٹکا دیے ہاتھ اُس نے ہمک کر گئی باری
ماں نے کہا لو گود میں آتے ہیں یہ واری　اصغر کی طرف ہاتھ اُٹھا کر وہ پکاری
پھر جیتی ملوں یا نہ ملوں تجھ سے بُلاؤں
آ چھوٹے مسافر تجھے چھاتی سے لگاؤں

ماں باپ کو اولاد کے صدمے سے بڑھ کر اور کوئی صدمہ نہیں ہوتا، کون باپ ایسا ہوگا جس کے جگر کا ٹکڑا اس کے سامنے دم توڑ رہا ہو اور اُس کے دل پر صدمہ نہ ہو، اُس کی آنکھیں اشک آلود نہ ہوں، حضرت امام حسین علیہ السلام پیکر صبر و رضا ضرور تھے، اور ان کا سرِ اقدس مرضی مولا میں ہمیشہ خم رہا، لیکن بہر حال انسان تھے، جوان بیٹے کی لاش دیکھ کر دل پر صدمہ کیوں نہ ہوتا۔

اولاد کے صدمے کا بیان میر انیس اور مرزا دبیر نے تمام انداز میں کیا ہے لیکن پڑھنے کے بعد آنکھیں پُرنم ضرور ہو جاتی ہیں۔

انیس

دشمن کو بھی خدا نہ دکھائے پسر کا داغ
دل کو فگار کرتا ہے لختِ جگر کا داغ
آنکھوں کا نور کھوتا ہے نورِ بصر کا داغ
مرنا جوان بیٹے کا ہے عمر بھر کا داغ

یہ حال اپنی فاطمہؑ کے دل سے پوچھئے
زخمِ جگر کے درد کو گھائل سے پوچھئے

ماں باپ کی آسائش و راحت ہے پسر سے
تلخی میں بھی جینے کی حلاوت ہے پسر سے
خوں جسم میں آنکھوں میں بصارت ہے پسر سے
ایامِ ضعیفی میں بھی طاقت ہے پسر سے

آرام جگر، قوتِ دل، راحتِ جاں ہے
پیری میں یہ طاقت ہے کہ فرزند جواں ہے

مالک سے بھرے گھر کے اُجڑ جانے کو پوچھو
گھر والوں سے اس تفرقہ پڑ جانے کو پوچھو
ماں باپ سے قسمت کے بگڑ جانے کو پوچھو
یعقوب سے یوسف کے بچھڑ جانے کو پوچھو

اللہ دکھائے نہ الم نورِ نظر کا
بہہ جاتا ہے آنکھوں سے لہو قلب جگر کا

دبیر

وہ درد ہے کیا درد کہ درماں نہیں رکھتا
وہ رنج ہے کیا رنج کہ پایاں نہیں رکھتا
کس زخم کا مرہم دلِ انساں نہیں رکھتا
کس چاک کا پیوند گریباں نہیں رکھتا

بے صبر جس اندوہ میں ہر ایک بشر ہے
وہ داغِ پسر داغِ پسر، داغِ پسر ہے

جس درد کی تسکین میں عاجز ہیں خردمند　　وہ درد ہے کیا علت فرزند جگربند
جب دست و گریباں ہو پدر سے غم فرزند　　وہ چاک ہی چاک ہے جس کا نہیں پیوند
سچ پوچھو تو فرزند کلیجہ ہے پدر کا
ناسور جگر میں نہ ہو اس لخت جگر کا

فرزند گل باغ تمنائے پدر ہے　　بے قدر ہے وہ شاخ جو بے برگ و ثمر ہے
تعویذ تسلیٔ دل خلق پسر ہے　　داغ اس کا شگافِ جگر و زخم جگر ہے
کیوں دل میں پدر کے نہ ہو ناسور خلف کا
جب چاک گہر کے لئے سینہ ہو صدف کا

لیکن مشیت ایزدی یہی تھی، عشق الٰہی کا تقاضا یہی تھا کہ آنکھوں کے سامنے عزیز و اقارب بھتیجے اور بھانجے، اور بیٹے شہید ہوں، حضرت علی اکبر کے چھوٹے بھائی، ششماہہ بچہ، حضرت علی اصغر، ننھا مجاہد پیاس سے بے چین ہو کر بار بار اپنی زبان ہونٹوں پر پھیرتا ہے، باپ اس تکلیف کو برداشت نہیں کر سکے، گود میں لئے ہوئے خیموں سے باہر چلے آئے، خیال تھا کہ نانا جان کا کلمہ پڑھنے والے اتنے زیادہ شقی القلب نہ ہوں گے کہ وہ اس ننھے بچے کو پیاسا دیکھ کر نہ پسیجیں۔ شانِ امامت، پانی کی طلب سے مانع تھی، اس لئے طلب آب بھی ایسے انداز سے کیا کہ حسینی آن قائم رہی ۔

انیس

بولے دکھا کے بچہ کو شاہِ فلک سریر　　مرتا ہے پیاس سے یہ مرا کودک صغیر
پانی ملا ہے کل سے نہ ممکن ہوا ہے شیر　　للہ اس غریب پر کر رحم اے امیر

مہماں ہے کوئی آن کا ہونٹوں پہ جان ہے
اس کا قصور کیا ہے کہ یہ بے زبان ہے

برپا ہے اہلبیت محمد میں شور و شین　　در پر پھوپھی بلکتی ہے ماں کر رہی ہے بین
آنکھیں پھرائے دیتا ہے اب تو یہ نور عین　　لایا ہے اس عطش پہ ترے پاس اب حسینؑ
تجھ کو قسم ہے روح رسالتمآب کی
ٹپکا دے اس کے حلق میں اک بوند آب کی

دبیر

ہر اک قدم پہ سوچتے تھے سبط مصطفےٰ　　لے تو چلا ہوں فوج عمرو سے کہوں گا کیا
نہ مانگنا ہی آتا ہے مجھ کو نہ التجا　　منت بھی گر کروں گا تو کیا دیں گے یہ بھلا
پانی کے واسطے نہ سنیں گے عدو مری
پیاسے کی جان جائے گی اور آبرو مری

پہنچے قریب فوج تو گھبرا کے رہ گئے　　چاہا کریں سوال پہ شرما کے رہ گئے
غیرت سے رنگ فق ہوا تھرا کے رہ گئے　　چادر پسر کے چہرہ سے سرکا کے رہ گئے
آنکھیں جھکا کے بولے یہ ہم کو لائے ہیں
اصغر تمہارے پاس غرض لیکے آئے ہیں

گر میں بقول عمرو شمر ہوں گناہگار　　یہ تو نہیں کسی کے بھی آگے قصوروار
شش ماہہ، بے زباں نبی زادہ شیرخوار　　ہفتم سے سب کے ساتھ پیاسا ہے شیرخوار
سن ہے جو کم تو پیاس کا صدمہ زیادہ ہے
مظلوم خود ہے اور یہ مظلوم زادہ ہے

یہ کون بے زباں ہے تمھیں کچھ خیال ہے ۔ دُرِ نجف ہے بانوے بیکس کا لال ہے
لو مان لو تمھیں قسم ذوالجلال ہے ۔ یثرب کے شاہزادے کا پہلا سوال ہے
پوتا علی کا تم سے طلبگار آب ہے
دیدو کہ اس میں ناموری ہے ثواب ہے

پھر ہونٹ بے زبان کے چومے جھکا کے سر ۔ رو کر کہا جو کہنا تھا وہ کہہ چکا پدر
باقی رہی نہ بات کوئی اے مرے پسر ۔ سوکھی زبان تم بھی دکھا دو نکال کر
پھیری زباں لبوں پہ جو اس نور عین نے
تھرا کے آسمان کو دیکھا حسینؑ نے

حضرت امام حسین علیہ السلام میدان جنگ میں جانے کی تیاری کر رہے ہیں، اس وقت ایک ایک صبر و تحمل کی تلقین فرماتے ہیں، شہزادی سکینہ کے پاس آ کر وصیت کرتے ہیں، رنج آمیز محبت اور صبر آمیز وصیت کا انداز ملاحظہ ہو۔

انیس

دنیا ہے یہ، شادی ہے کبھی اور کبھی آلام
راحت کبھی صبح، مصیبت کی کبھی شام
یکساں نہیں ہوتا کسی آغاز کا انجام
وہ دن گئے کرتی تھیں جو اس سینے پہ آرام
ضد کر کے نہ اب باپ کو رو یا کرو بی بی
جب ہم نہ ہوں تو خاک پہ سویا کرو بی بی

دبیر

سینے پہ مرے سو چکیں اب خاک پہ سونا
آخر ہے زمیں بھی تو غریبوں کا بچھونا
گو قہر ہے اس سن میں جدا باپ سے ہونا
لاشہ مرا تڑپے گا بہت مجھ کو نہ رونا
گر چاہو مری روح ہو نا شاد سکینہ
تو غم میں مرے کیجیو فریاد سکینہ

مرثیہ کا وہ حصّہ بڑا دردناک ہے جب امام حسینؑ تن تنہا رہ گئے، اور اعدا نے چاروں طرف سے انھیں گھیر لیا، ایک طرف ان کی تنہا ذات رہ گئی تھی جو اعلائے کلمۃ الحق کے لئے سب کچھ قربان کر چکی تھی، اور اب اپنی جان، جان آفریں کے سپرد کرنے اور جام شہادت نوش کرنے کے لئے بیتاب تھی، دوسری طرف اسی کے نانا جان کا کلمہ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ پڑھنے والے، زبان سے طاغوتی قوتوں کا انکار کرنے والے، مگر دل سے ان کا اقرار کرنے والے، بہادری اور جوانمردی کا دعویٰ کرنے والے اپنے نبیؐ کے نواسوں پر تلواروں، نیزوں اور خنجروں سے شدت کے ساتھ حملہ کر رہے تھے کہ کاشانۂ نبوت کی یہ آخری شمع جلد خاموش ہو جائے اور اسلام میں سنت نبویؐ کے بجائے سنت قیصر و کسریٰ پر عملدر آمد ہونے لگے؛ امام مظلوم زخموں سے چور چور ہو چکے ہیں۔ اس تنہائی و بیکسی کا نقشہ دونوں باکمالوں نے اس طرح کھینچا ہے۔

انیس

آج شبیرؑ پہ کیا عالم تنہائی ہے ظلم کی چاند پہ زہرا کے گھٹا چھائی ہے
اس طرف لشکر اعدا میں صف آرائی ہے یاں نہ بیٹا، نہ بھتیجا، نہ کوئی بھائی ہے

برچھیاں کھاتے چلے جاتے ہیں تلواروں میں
"مار لو پیاسے کو" ہے شور ستمگاروں میں

لاکھ شمشیریں ہیں اور ایک تنِ اطہر ہے ایک مظلوم ہے اور ظالموں کا لشکر ہے
سیکڑوں خنجر فولاد ہیں اور اک سر ہے نہ کوئی یار نہ ہمدم نہ کوئی یاور ہے

باگ گھوڑے کی لٹکتی ہے اٹھا سکتے نہیں
سامنے اہل حرم روتے ہیں جا سکتے نہیں

دبیر

مومنو بے کس و بے یار ہے مظلوم حسین — سخت آفت میں گرفتار ہے مظلوم حسین
کیا سراسیمہ و ناچار ہے مظلوم حسین — دل شکستہ جگر افگار ہے مظلوم حسین
نیزے کاری ہیں لگے زخم پہ شمشیروں کے
نیزوں کے زخموں میں پیوستہ ہیں پھل تیروں کے

کیا رحیمی ہے کہ غصہ نہیں آتا ہے ذرا — کیا کریمی ہے کہ سر کرتے ہیں امت پہ فدا
کیا تحمل ہے کہ ہر زخم پہ ہے شکر خدا — کیا شجاعت ہے کہ لاکھوں میں کھڑے ہیں تنہا
تیر بھی نیزے بھی سینے پہ لئے جاتے ہیں
پر دعا نانا کی امت کو دئے جاتے ہیں

حادثۂ کربلا کے بعد اہلبیت اطہار جب اعدا کی نگرانی میں روانہ ہوئے اور انھیں نظر بند رکھا گیا تو ہندا انھیں دیکھنے کے لئے آئیں، ہند کی آمد اور قید خانہ میں ان کی حالت کیسی تھی اور کس طرح انھیں رکھا گیا تھا۔ اس واقعہ کو میر و مرزا دونوں نے لکھا ہے بعض مضامین مشترک ہیں۔

انیس

کیجئے شکستگی خرابہ کا کیا بیاں — ثابت نہ جس میں سقف نہ در تھا نہ سائباں
وحشت کا گھر ہراس کی جا خوف کا مکاں — وہ شب کہ الحذر وہ اندھیرا کہ الاماں
ظلمت سرائے گور تھی زنداں کا گھر نہ تھا
حجرے یہ تنگ تھے کہ ہوا کا گذر نہ تھا

یہ سن کے ہند رونے لگی تب بہ اشک و آہ — پھر مڑ کے دوڑے حضرت زینب پہ کی نگاہ
منہ سے ہٹائے بال تو حالت ہوئی تباہ — بے ساختہ کہا کہ زہے قدرت الٰہ

ہرگز غلط نہیں جو مجھے اشتباہ ہے
زینب تمھیں ہو خالق اکبر گواہ ہے

دبیر

راوی نے حال خانۂ زنداں ہے یوں لکھا وحشت میں مثل قبر اور آفت میں کربلا
آئی جو شب اسیر کو صدمہ بڑا ہوا نہ فرش تھا، نہ سایہ، نہ پانی، نہ غذا
شمعوں کی روشنی نہ چراغوں کی روشنی
بس ماتم حسینؑ کے داغوں کی روشنی

زینب کو بھی سکوت کا یارا نہ پھر رہا بولے نہ اُن سے پوچھ یہ زینب کا ماجرا
کیا جانیے کہ بعد حسینؑ اس پہ کیا ہوا قدموں پہ ہند گر پڑی پہچان کر صدا
رو کر کہا قسم مجھے ربِ قدیر کی
زینبؑ تمھیں ہو بیٹی جناب امیرؑ کی

شب عاشورہ ختم ہو چکی، شمع شہادت کے پروانے، شب بھر یاد الٰہی میں مصروف رہے، ذکر و فکر تسبیح و تہلیل، کا یہ شغل صبح تک جاری رہا، صبح عاشورہ کا آفتاب طلوع ہوا۔ لیکن یہ آفتاب شہدائے کربلا کے غم میں، گریہ کناں معلوم ہوتا تھا۔

انیس

تھا بسکہ روز قتل شہِ آسماں جناب نکلا تھا خوں ملے ہوئے چہرے پہ آفتاب
تھی نہر علقمہ بھی خجالت سے آب آب روتا تھا پھوٹ پھوٹ کے دریا میں ہر حباب
پیاسی جو تھی سپاہ خدا تین رات کی
ساحل سے سر پٹکتی تھیں موجیں فرات کی

دبیر

تھی بسکہ صبح قتل شہنشاہِ نامدار　　اہلِ حرم تھے جیب دریدہ اور اشکبار
تارِ شعاع سے یہی ہوتا تھا آشکار　　خورشید نے کیا ہے گریباں کو تار تار
پو پھٹتے ہی رسول کا داماں پھٹ گیا
زہرا کے بھی کفن کا گریبان پھٹ گیا

میدان کربلا میں قیامت کی گرمی ہوتی ہے، تمازتِ آفتاب، دھوپ کی شدت، لو کا چلنا، بالو کا تپنا، پانی اور سایہ کا نہ ہونا۔ ان سب کا بیان دونوں باکمالوں نے کیا ہے۔

انیس

وہ دھوپ کی تیزی غضب اور لو کا وہ چلنا　　وہ دو پہر اس وقت کی اور دن کا وہ ڈھلنا
ہر ایک بدن سے وہ پسینے کا نکلنا　　اور تن پہ حرارت سے وہ ہتھیاروں کا جلنا
جنگل کے پرندے بھی جھیلوں میں پڑے ہیں
اور دھوپ میں پیاسے شہِ مظلوم کھڑے ہیں

دبیر

وہ دھوپ کہ مرغان ہوا کرتے ہیں نالا　　بس ہاتھ دھرا قبضہ پہ اور پڑ گیا چھالا
بریاں ہوا دانہ بھی زراعت میں جو ڈالا　　اس دھوپ میں اس لو میں کھڑے ہیں شہِ والا
پانی کے عوض آگ برستی ہے زمیں پر
پر تیروں کی بوچھار ہے جسمِ شہِ دیں پر

مرثیوں میں ایک بات خاص طور پر ملحوظ رکھی گئی ہے کہ حریف مقابل کو بزدل، حقیر یا ذلیل نہیں بتایا گیا بلکہ اُسے فنونِ جنگ کا ماہر اور بہادر ثابت کیا گیا ہے لیکن اندازِ بیان

ایسا اختیار کیا گیا' اور تشبیہیں اور استعارے ایسے استعمال کئے گئے کہ حریف مقابل کی یہی خوبیاں قابل نفرت بن گئیں۔ ذیل کے دو بندوں میں ایک پہلوان کی تصویر کھینچی گئی

انیس

سر تا بہ فلک معکوس' جبیں حد سے فزوں تنگ غدار' صلح شور و جفا پیشہ و سرہنگ
کہنے کو بشر' پہ قد و قامت کا نیا ڈھنگ حیران شب ظلمات ہو یہ تیرگی رنگ
پہلے سے یہ کالا تھا نہ اس دشمنِ رب کا
بن جائے تو اعکس سے آئینہ حلب کا

دبیر

سر تا بقدم زہر' زباں سانپ' دہن نار شعلہ تھی نگہ' آنکھ تھی تنور شرر بار
نخوت تھی وہ تیوری میں کہ تھے اپنے بھی بیزار تلوار دھرے چہرے پہ خود بینیِ غدار
اشتر پہ وہ تاری تھا کہ شعلہ بھی دھواں تھا
یارب کا بیشتہ تھا کہ جادو سے رواں تھا

گھوڑے اور تلوار کی تعریف میں بھی دونوں باکمالوں نے اپنے کمالات دکھائے ہیں' نئی نئی تشبیہات' جدت ادا اور ندرت بیان نے' ان دونوں چیزوں کو زمین سے آسمان پر پہنچا دیا' مبالغہ میں انتہائی غلو سے کام لیا۔ تلوار کی تعریف' اس کی کاٹ اس کی تیز رفتار کا بیان' رزمیہ شاعری کا بہترین نمونہ ہیں۔ گھوڑے اور اس کے سوا کی تعریف میں یہ بند ملاحظہ ہو۔

انیس

تھا زین فرس رحل تو قرآں شہ والا وہ تخت ہوا تھا تو سلیماں شہ والا
وہ دوش صبا بوئے گلستاں شہ والا وہ برج شرف نیر تاباں شہ والا

بو گل کی نسیم سحری لے کے چلی ہے
غل تھا کہ سلیماں کو پری لے کے چلی ہے

دبیر

مرکب تو ہے پر راکب ذیشاں بھی ہو ایسا
طور ایسا ہو تو موسیٰ عمراں بھی ہو ایسا
اور رنگ بھی ہو ایسا تو سلیماں بھی ہو ایسا
اس شان کی ہو رحل تو قرآں بھی ہو ایسا
آہو بھی کہیں، شیر حجازی ہو تو ایسا
غازی ہو تو ایسا ہو جو تازی ہو تو ایسا

ان مثالوں سے دونوں باکمالوں کا رنگ شاعری بخوبی ظاہر ہو جاتا ہے۔ میر انیس کے یہاں دہلی اسکول کی خصوصیات بدرجہ اتم ہیں، فصاحت و سلامت، زبان کی صفائی و پاکیزگی بیان کی سادگی، بندش کی خوبی، روزمرہ اور محاورہ کا برمحل استعمال، بہترین اور اعلیٰ ہے۔ وہ شاعری کو جذبات کا آئینہ سمجھتے تھے۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ حالات اور مناظر کی چلتی پھرتی، جیتی جاگتی تصویریں پڑھنے والے کے سامنے پیش کی جائیں، اور اس مقصد میں وہ کامیاب ہوئے۔

مرزا دبیر لکھنؤ اسکول کے پیرو تھے تاریخ اسکول کی تمام خصوصیات ان میں موجود ہیں، مضمون آفرینی مشکل پسندی، مبالغہ آرائی، صنائع لفظی، تخئیل کی بلندی ان کے یہاں زیادہ ہے۔ مختصر یہ کہ انیس معنی آفریں ہیں، اور دبیر مضموں آفریں ان کا انداز بیان سادہ ہے، مرزا دبیر کا مشکل غرض میر انیس اور مرزا دبیر دو مختلف اسکول اور دو مختلف انداز فکر کے نمائندے تھے، اور ان دونوں کے مطالعہ کے بعد بے ساختہ یہ شعر دل سے زبان پر آجاتا ہے۔ ؎

کسی نے تری طرح سے اے انیس
عروسِ سخن کو سنوارا نہیں

پرنٹر:۔ کے۔ بی۔ اگروالا۔ شانتی پریس۔ الہ آباد

حوالہ جات

آب حیات ۔ مولانا محمد حسین آزاد

اردو شاعری پر ایک نظر } پروفیسر کلیم الدین احمد
اردو تنقید پر ایک نظر }

المیزان ۔ چودھری نظیر الحسن

انیس کی مرثیہ نگاری ۔ اثر لکھنوی

تاریخ ادب اردو ۔ ڈاکٹر رام بابو سکسینہ

تذکرہ جواہر سخن ۔ محمد مبین کیفی

تعبیر تشریح و تنقید ۔ مسیح الزماں جائسی

حیات انیس ۔ مولوی امجد علی اشہری

سیرت حسین ۔ مولوی امیر احمد علوی

حیات دبیر ۔ ثابت لکھنوی

ستاروں سے آگے ۔ ناظر کاکوروی

خمخانۂ جاوید ۔ لالہ سری رام ایم۔ اے

دہلی کا دبستان شاعری ۔ ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی

روح انیس ۔ سید مسعود حسن رضوی ادیب

شعر الہند حصہ (۱) و (۲) مولانا عبد السلام ندوی

مثنویات ۔ مولوی امیر احمد علوی

گل رعنا ۔ مولانا عبد الحیٔ

شعر الہند ۔ مولانا عبد السلام ندوی

لکھنؤ کا دبستان شاعری ۔ ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی ۔

مراۃ الشعراء حصہ ۱، ۲ ۔ محمد یحییٰ تنہا

مطالعہ شبلی } ناظر کاکوروی ۔
مطالعہ حالی }

مراثی انیس جلد ا تا ۴ ۔ مرتبہ نظم طباطبائی ۔ نظامی پریس (بدایوں)

موازنہ انیس و دبیر ۔ علامہ شبلی

مقدمہ شعر و شاعری ۔ مولانا حالی

واقعات کربلا ۔ سید منظور علی علوی

ادبی ستارے ۔ شریف الحسن و شجاعت علی ص

لکھنوی شعراء ۔ ناظر کاکوروی

مجموعہ رباعیات میر انیس ۔ مرتبہ سید محمد عباس ایم اے

وقار انیس ۔ مہذب لکھنوی

اردو شاعری کا پس منظر ۔ مشیر احمد علوی

اردو شاعری ۔ امیر احمد علوی

یادگار انیس ۔ امیر احمد علوی

تذکرہ رند ۔ مولوی امیر احمد علوی

اردو میں تنقید ۔ ڈاکٹر احسن فاروقی

تنقیدی مقالات ۔ ڈاکٹر محی الدین قادری زور

ہندو ادب ۔ ناظر کاکوروی

روح تنقید ۔ ڈاکٹر محی الدین قادری

اردو کا شکسپیر، مختلف رسالے و ماہنامے
نگار، الناظر، اردو علیگڑھ میگزین اج
تعمیر ہماری آواز
ادب اردو، فروغ اردو، ماہ نو، ہندستانی
اردو کی ذہنی تاریخ

(مولوی سراج الحق، مولانا اصغر حسین اصغر

Scanned by CamScanner